بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللّٰھم صلّ علیٰ سیّدنا محمد النبی

الاُمّیّ وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ وبارک وسلّم

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی

حکمرانی و جانشینی

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

مترجم:

پروفیسر خالد پرویز

E-mail:beaconbookspakistan@hotmail.com
E-mail:beacon_books_pakistan@yahoo.com

اشاعت : 2006ء

عبدالجبار نے
لعل سٹار پرنٹنگ پریس سے
چھپوا کر بیکن بکس ملتان-لاہور
سے شائع کی۔
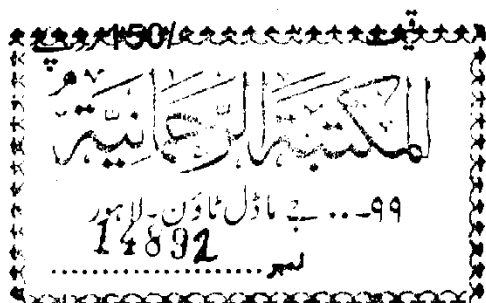
ISBN 969 - 534 - 061 - X

انتساب

شفیع عاصیاں

نبیؐ آخرالزماں

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے

نام

پروفیسر خالد پرویز

11/6 فیصل اسٹریٹ، گلگشت ملتان

061-6522252 / 300-6302548

ایک نظر

ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی انگریزی کتاب

The Prophet's Establishing
A State and His Succession

کا اُردو ترجمہ مطالعہ فرمایئے اور دل و دماغ کو معطر و منوّر کیجئے۔

اس کے دو مضامین ''اسلامی سلطنت کی تنظیم'' اور ''دنیا کا پہلا تحریری دستور'' ایسے ہیں جنہیں ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے انگریزی و اُردو دونوں زبانوں میں تحریر کیا چنانچہ انہیں ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

آخر میں ایک مضمون ''حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہلے خلیفہ کیوں نہ ہوئے'' ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک اور انگریزی کتاب میں شامل تھا جسے موضوع کی مناسبت سے یہاں شامل کر دیا گیا ہے تاکہ مصنف کا نقطۂ نظر قاری تک مکمل شکل میں پہنچ سکے۔

میرے حق میں دعا ضرور کیجئے گا کہ رب رحمٰن و رحیم مجھے قلم و کتاب کی دوستی سے مستفیض فرمائے رکھنے کے ساتھ حاسد کے حسد اور جن و بشر کے شر سے محفوظ و مامون رکھے۔

پروفیسر خالد پرویز

حسن ترتیب

صفحہ نمبر

I	اسلام میں آئینی مسائل	9
II	دُنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور	44
III	پہلے تحریری دستور کی دفعات	60
IV	اسلام میں ریاست کا تصور	66
V	اسلامی سلطنت کی تنظیم (قرآن کے آئینے میں)	96
VI	مسلم مملکت میں مالیاتی نظم ونسق	123
VII	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں بجٹ سازی اور ٹیکسیشن	134
VIII	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحیثیت سیاسی مدبر (ذمیوں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حُسن سلوک کے اثرات)	147
IX	جنگ جمل اور صفین کے پس پردہ یہودی ہاتھ	151
X	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے بستر وصال پر وصیت لکھوانے کا قصہ	172
XI	حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ پہلے خلیفہ کیوں نہ ہوئے؟	194

I

اسلام میں آئینی مسائل

آئین ایک وسیع موضوع ہے۔ زیر نظر جائزے میں ہم عام الجماعۃ (حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مابین صلح کے بعد اسلامی سلطنت کے دوبارہ متحد ہو جانے کا سال) کے بعد کے ادوار کو نہیں چھیڑیں گے اور صرف زیادہ اہم معاملات کو ہی زیر بحث لایا جائے گا۔

پس منظر

اسلام کا آغاز **609**ء میں مکہ سے ہوا۔ اس خطے میں قریش قبیلے کے لوگوں کی اکثریت تھی جس میں غلاموں اور آزاد کردہ غلاموں (مولا) کی بھی ایک قابل ذکر تعداد آباد تھی۔ تاہم تمام اہل قریش شہری اور متمدن زندگی نہیں گزار رہے تھے بلکہ خانہ بدوش قریشیوں کی تعداد بھی کم نہ تھی جو مکہ کے مضافات یا ملحقہ علاقوں میں گھومتے رہتے تھے۔ (**1946**ء میں مجھے ایسے ہی قریشی بدوؤں سے ملاقات کا اتفاق ہوا جو مکہ کے مشرق میں ذوالمجاز نامی کنویں کے پاس ابھی تک آباد تھے) آئینی مسائل ان دونوں قسم کے لوگوں کے لیے یکساں نہیں تھے۔

ایسا کوئی یقینی ریکارڈ دستیاب نہیں جس سے یہ حتمی تعین کیا جا سکے کہ اس وقت خانہ بدوش قبائل اپنا سردار کس طرح منتخب کرتے تھے خصوصاً پہلے سردار کے (انتقال کے) بعد انتخاب کی نوعیت کیا ہوتی تھی۔ ممکنہ طور پر قبیلے کے سب افراد ایک جگہ جمع ہوتے اور سمجھدار اور بزرگ ارکان قبیلہ کی تجویز پر کسی زیرک، بہادر اور یقیناً مالی طور پر خوشحال شخص کو

تا حیات سردار چن لیا جاتا جو جنگ اور امن دونوں صورتوں میں اپنے قبیلے کی رہنمائی کرتا تاہم ایسا ریکارڈ دستیاب نہیں جس سے یہ اندازہ ہو کہ اسے سزا دینے یا جرمانہ کرنے کے عدالتی اختیارات بھی حاصل ہوتے تھے کجا یہ کہ وہ زندگی اور موت کے بارے میں فیصلہ کر سکے۔ یہاں تک کہ کسی کے سماجی بائیکاٹ کا فیصلہ بھی قبیلے کی مجلس بزرگان ہی کرتی تھی تاہم قریش مکہ نے ایک شہری ریاست قائم کر لی تھی جس کا انتظام قریش کے دس بڑے خاندانوں کے نمائندوں پر مشتمل کونسل چلاتی تھی (ملاحظہ ہو میرا مضمون مکہ کی شہری ریاست۔ مطبوعہ در رسالہ اسلامک کلچر (انگریزی) حیدر آباد دکن XII / 3، جولائی 1938 صفحہ 255-276 اور میری کتاب پیغمبر اسلام (فرانسیسی میں)۔ اس ریاست میں کوئی صدر ہوتا تھا اور نہ بادشاہ اور یہ کوئی فرد واحد کی آمرانہ حکومت بھی نہ تھی۔ کونسل، ابن کلبی کے مطابق (بحوالہ العقد از ابن عبد ربہ) درج ذیل شعبوں یا محکموں پر مشتمل تھی۔

.1	چاہ زمزم کی نگرانی (سقایت)	اس کی ذمہ داری بنو ہاشم کے پاس تھی۔
.2	عقاب (قومی پرچم کی علمبرداری)	اس کے منتظم بنو امیہ تھے۔
.3	لوا (قبائلی علم) کعبہ کی پاسبانی دارالندوہ (پارلیمنٹ ہاؤس کی نگرانی۔	اس کا انتظام بنو عبدالدار کے پاس تھا۔
.4	سٹیٹ کونسل (شوریٰ)	یہ ذمہ داری بنو اسد کے کندھوں پر تھی۔
.5	اشناق (دیت اور جرمانوں کا انتظام)	اس منصب پر بنو تیم فائز تھے۔
.6	قبہ (فوجی کیمپ کا انتظام اور شہسواروں کی قیادت اور مذہبی بڑے کھانوں کے موقع پر بتوں کے جلوس کی قیادت۔	یہ منصب بنو مخزوم کے پاس تھا۔
.7	سفارت (خارجہ تعلقات اور	

	قبیلے کی شہرت کا دفاع)	یہ ذمہ داری بنوعدی کے سپرد تھی۔
.8	مالیات	اس کے نگران بنونوفل تھے۔
.9	ایسار (فال گیری اور قسمت دریافت کرنے کے لیے بتوں کے پاس جو تیر رکھے ہوتے تھے ان کی تولیت	یہ منصب بنوجمح کو حاصل تھا۔
.10	حکما (جھگڑوں اور مقدمات کا فیصلہ کرنا۔ اس کے علاوہ کعبہ کے خزانے اور نذرانوں کی نگرانی۔	یہ کام بنوسہم کے سپرد تھا۔

ان کے علاوہ کچھ ذیلی مناصب اور ذمہ داریاں بھی تھیں جنہیں قریش نے باہم تقسیم کر رکھا تھا۔ ان میں ایام حج کے دوران عرفات اور مزدلفہ میں ادا کئے جانے والے ارکان حج کی نگرانی اور اس کے علاوہ ایام حج کے تعین کی ذمہ داری شامل تھی (قرآنی حکم سے پہلے ایام حج متعین نہ تھے۔ مترجم) یہ تمام ذمہ داریاں حج سے متعلق تھیں جس کا محور نکتہ بیت اللہ تھا جو مکہ میں واقع ہے مگر وراثتی طور پر یہ ذمہ داریاں "غیر ملکی" قبائل کے سپرد تھیں جس کے پیچھے تاریخی عوامل کارفرما تھے۔ مکہ کے موالی خاندانوں (آزاد کردہ غلام) میں سے ایک بیت اللہ کی تعمیر و مرمت کا ذمہ دار تھا اور یہ منصب نسل در نسل چلا آتا تھا۔ دارالندوہ (پارلیمنٹ) کے اجلاس میں 40 اور اس سے زیادہ عمر کے تمام مردوں کو شریک ہونے کی اجازت تھی جو اپنے تمام فیصلے وہیں کرتے۔ یہ واضح نہیں کہ آیا "وزراء" کی کونسل بھی مکمل اجلاس (کابینہ کے انداز میں) منعقد کرتی تھی یا ہر "وزیر" اپنے آزادانہ فیصلے کا اختیار رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ تمام فیصلے مجلس شوریٰ (کونسل آف سٹیٹ) کے انچارج "وزیر" کو پیش کئے جاتے اور اس کی منظوری کے بعد ہی ان پر عملدرآمد کیا جاتا۔ تاہم اس کی تفصیلات میسر نہیں ہیں۔ دس قبائل کے نمائندوں کے انتخاب کا طریق کار بھی واضح نہیں۔ گو ذمہ

داریاں متعلقہ قبائل کے ہی سپرد ہوتیں لیکن قبیلے کے سردار کے انتخاب کا طریقہ مکمل طور پر واضح نہیں۔ مثلاً عبدالمطلب چاہ زمزم کے نگران تھے اور حاجیوں کو پانی پلوانے کی ذمہ داری ان کے سپرد تھی۔ ان کے انتقال پر یہ منصب ان کے ایک چھوٹے صاحبزادے ابوطالب کے سپرد ہوا جنہوں نے اپنا یہ حق اپنے بھائی عباس کو بیچ دیا۔ ابو طالب کے انتقال پر خاندان کی سربراہی کا تاج ان کے بھائی ابولہب کے سر پر رکھا گیا اور یہ بات واضح نہیں ہے کہ اس کا انتخاب کس طرح اور کیوں ہوا۔ یہ ابولہب ہی تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سماجی بائیکاٹ کروایا۔ پہلے انہیں طائف میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی ریشہ دوانیوں کے باعث مکہ میں ہی ایک خاندان کی پناہ حاصل کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ عباس بدستور چاہ زمزم کے نگران کی حیثیت سے 10 رکنی کونسل کے رکن کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔

اگرچہ قبیلے یا خاندان کے سربراہ کے انتخاب کا طریق کار تو سامنے نہیں مگر ایک بات واضح ہے کہ یہ انتخاب تاحیات ہوتا تھا۔ حکومت وراثت کی بجائے بذریعہ انتخاب حاصل ہونا جمہوریت کی خصوصیت ہے جبکہ ایک مخصوص اور محدود مدت کی بجائے تاحیات حکومت بادشاہت کی دین ہے یہاں دونوں خصوصیات کا امتزاج نظر آتا ہے۔ عرب خانہ بدوش قبائل اور شہری ریاستوں کا اپنا مخصوص نظام حکومت تھا جو نہ تو جمہوری تھا اور نہ بادشاہی۔ مکہ میں 10 رکنی کونسل تو موجود تھی مگر اس کا صدر کوئی بھی نہ تھا جس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک سرداری نظام پر مبنی ''گروپ حکومت'' تھی یا جسے آج کے حوالے سے ''مذہبی اکابرین'' کی حکومت کا نام دیا جا سکتا ہے (کہ اس میں کعبہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی) اسے جمہوریت بھی قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں اقتدار اعلیٰ ایک فرد (یا افراد) کے پاس تھا یعنی قبائل یا شہریوں کے نمائندوں کے پاس۔

مدینہ کا بھی ذکر ہو جائے جسے مسلمانوں نے اپنا دوسرا وطن بنایا۔ اس شہر میں کوئی حکومت یا ریاست نہ تھی۔ ایک عرب قبیلہ بنو قیلہ یہاں رہتا تھا جو دو متحارب قبیلوں اوس اور خزرج میں بٹا ہوا تھا۔ یہ دو بھائی تھے جو دشمن بن گئے تھے۔ متعدد یہودی قبائل بھی تھے مگر ان کی حیثیت ان دونوں قبائل کے سامنے ان کے زیردستوں کی سی تھی اور وہ ان سے

دب کر رہتے تھے حالانکہ مالی طور پر خوشحال تھے اور مالی حوالے سے انہیں بالا دستی حاصل تھی۔ اوس اور خزرج اکثر باہم بر سر پیکار رہا کرتے تھے۔ ان میں آخری لڑائی بعاث کے مقام پر ہوئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ سے تھوڑا ہی عرصہ قبل ختم ہوئی تھی۔ اس میں اوس کی قوت ٹوٹ گئی اور باقی ماندہ لوگ خزرج کے ایک تہائی سے بھی کم رہ گئے۔ ان خطوں کے بارے میں زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ان میں سے بعض بیرونی طاقتوں کی کالونیاں بن چکی تھیں۔ عرب کے شمال میں بازنطینی اور مشرق اور جنوب میں ایرانی اپنے حلقہ ہائے اثر قائم کیے ہوئے تھے اور ان چھوٹی چھوٹی زیر اثر ریاستوں میں انہوں نے مقامی عربوں کو ہی حکمران بنا رکھا تھا۔ حیرہ میں لخمی خاندان اور عمان میں پہلے جلندہ ابن مستکبر اور اس کی وفات پر اس کے دو بیٹوں جیفر اور عبد کو مشترکہ طور پر حکمران بنا دیا گیا۔ دومۃ الجندل کے کیس میں بھی معاملات عجب ڈھلمل انداز میں چلائے جا رہے تھے وہاں ایک بادشاہ ضرور تھا مگر ابن الکلبی کے مطابق (ابن حبیب ''المحبر'' صفحہ 263-264) وقفوں وقفوں سے تبدیل ہوتا رہتا تھا۔ اصل میں ہوتا یہ تھا کہ سالانہ میلے میں دونوں حریف امیدوار ایک دوسرے سے پہیلیاں بجھواتے تھے اور جو جیت جاتا وہ ایک سال کے لیے بادشاہ چنا جاتا۔ طائف میں جو مکہ سے قریب ایک بڑا شہر تھا دو قبیلے بظاہر امن اور صلح سے رہ رہے تھے لیکن کوئی باقاعدہ حکومتی نظم نہ تھا۔

ظہور اسلام

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو بعد میں منصب نبوت پر فائز ہوئے مکہ کے شہری اور بنو ہاشم خاندان کے فرزند تھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں کی حکومت یا انتظامیہ میں کوئی حصہ نہ تھا نہ تو اسلام سے قبل اور نہ ہی اس کے آغاز پر بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک چچا کونسل میں خاندان کی نمائندگی کرتے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ شروع کی جو بت پرستی کی ممانعت پر مبنی تھی تو شرک اور بت پرستی کے خوگر معاشرے کی

طرف سے شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا تاہم اس کے ساتھ ساتھ مسلمان ہونے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہا جن میں سے بیشتر نوجوان تھے۔ ایک قابل ذکر تعداد ایسے نوجوانوں کی تھی جن کی عمریں 20 یا اس کے قریب تھیں۔ بڑوں کی طرف سے مخالفت میں شدت اس بنا پر بھی تھی کہ ان کے اپنے بچے انہیں چھوڑ کر نئے دین کے پیروکار بن چکے تھے۔ سختیوں کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا شہر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور وہ جاتے بھی کہاں؟ آج کے پاسپورٹ اور ویزا کی طرح اس دور میں بھی کسی دوسرے قبیلے میں جانے کے لیے ان کی رضامندی تو ضروری تھی۔ اس صورتحال کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ میں ریاست در ریاست کی ایک صورت پیدا ہوگئی۔ مسلمان اپنے معاملات فیصلہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر آتے جو ان کے لیے قانون ساز بھی تھے اور جج بھی جبکہ اپنی قوم کے لیڈر ہونے کا اعزاز بھی انہیں ہی حاصل تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بت پرستی اور شرک سے نفرت کرتے تھے تاہم کعبہ کو دونوں کی نظر میں تکریم حاصل تھی۔ اپنے اپنے طریقے کے مطابق مسلمان اور غیر مسلم وہیں عبادات کرتے تھے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کفار نے مسلمانوں کو کعبہ میں داخل ہونے سے روک نہ دیا جس کے بعد مسلمانوں نے اپنے گھروں میں عبادت شروع کر دی تاہم ان کا رخ کعبہ کی طرف ہی ہوتا تھا۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر میں بھی مسجد تھی۔ ابن ہشام صفحہ 246، البلاذری - انساب ا، 206۔ جبکہ حضرت ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر میں بھی مسجد تھی جہاں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام قبول کیا تھا۔ (البلاذری - دارالارقم)

پیغمبر کو بلاشبہ اللہ تعالیٰ نامزد فرماتا ہے مگر یہ کافی نہیں ہوتا بلکہ ضروری ہے کہ ہر فرد ان کی نبوت کو تسلیم کرے اور اس کا اقرار کرے اس لیے جو بھی مسلمان ہوتا اسے ذاتی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرنا پڑتی اور وہ اپنی تمام توانائیوں کے ساتھ ہر قسم کے حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے کا عہد کرتا۔ بعض اوقات فرد واحد نمائندہ بن کر پورے گروپ کے اسلام کا پیغام لاتا۔ ہجرت مدینہ سے قبل ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات دور دراز علاقوں سے لوگ آ کر اسلام قبول کرتے اور پھر

اپنے اپنے ملکوں کو واپس جاتے (اور وہاں تبلیغ اسلام کرتے اور لوگوں کو مسلمان بناتے)۔
ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (صحیح مسلم **133-132/44**) بدر سے، طفیل الدوسی حضر موت سے
(ابن ہشام صفحہ **4-252**) آئے جبکہ دوسرے لوگ کئی ممالک سے آئے مثلاً تمیم الدری
(ملاح) (صحیح مسلم **122-117/52**)۔

بیعت ایک طرح سے ایک عمرانی معاہدہ ہوتا ہے جو حاکم اور رعایا کے مابین کیا جاتا ہے۔ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر عمل کی پیروی کرتے تھے چاہے عمل کا تعلق مذہب یا عقیدے سے ہوتا یا اخلاقیات سے یا سماجی رویہ سے اور چونکہ زکوٰۃ کا ذکر مکی صورتوں میں تسلسل اور کثرت سے آیا تھا اس لیے ممکن ہے کہ مسلمان اپنی زکوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر آتے ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے مستحق مسلمانوں میں تقسیم فرمادیں۔ مکہ میں ''ریاست در ریاست'' کی جو صورت بن چکی تھی جس کے سربراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے ہر لحاظ سے ایک ریاست ہی تھی سوائے اس کے کہ اس کے پاس کوئی علاقہ نہ تھا تاہم مکمل آزادی تھی۔ حکمران اور رعایا میں ایک قلبی نوعیت کا رشتہ بھی استوار ہو چکا تھا۔ ریاست کے لیے علیحدہ قوانین بھی زیر تشکیل تھے۔

تیرہ برس کی طویل اور شبانہ روز جدوجہد کے بعد آخر کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ ہجرت کرنا پڑی جہاں کم از کم بارہ قبائل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار پر لبیک کہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قبیلہ کا ایک نقیب مقرر کر دیا اور ان کے اوپر ایک نقیب النقبا کا بھی تقرر فرمایا۔ (بلاذری، انساب **ا**، صفحہ **254**)۔ مدینہ تشریف آوری کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ مدینہ میں نہ صرف بدنظمی اور شورش کا دور دورہ ہے بلکہ وہ لوگ متمدن معاشرہ سے محروم زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام لوگوں کا ایک اجلاس بلوایا جس میں مسلمانوں کے علاوہ تمام یہودی، عیسائی اور بت پرست عرب بھی شریک ہوئے اور ان کے سامنے ایک ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی تاکہ اندرون ملک نظم ونسق اور امن وامان کی فضا قائم کی جائے اور بیرونی حملہ آوروں کے خلاف دفاع کا ایک باضابطہ نظام قائم کیا جائے۔ اسے قبول کرنے والوں نے ایک دستاویز تیار کی جس میں حکمران اور عام لوگوں کے حقوق وفرائض کا باقاعدہ تعین کیا۔ یہ

دستاویز مکمل شکل میں ہم تک پہنچی ہے اور یہ دنیا میں پہلے "تحریری ریاستی آئین" کی دستاویز ہے جو کسی حکمران نے پیش کیا جس میں سیاسی زندگی کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس میں خود مختاری اور آزادی، آبادی کے مختلف طبقات کے لیے مذہبی آزادی، نظام انصاف، سماجی تحفظ، دفاع، سفارت کاری، قانون سازی سمیت تمام معاملات شامل کئے گئے ہیں۔ غیر مسلم رعایا کو نہ صرف ذاتی معاملات میں آزادی حاصل تھی بلکہ انصاف، قانون اور قانون سازی کے معاملے میں بھی وہ خود مختار تھے۔ (میں نے اس موضوع پر الگ تفصیل سے لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو **The First Written Constitution in the World** لاہور **1968** - میری کتاب پیغمبر اسلام (بزبان فرانسیسی) I، صفحات **(137-123)**۔

شروع شروع میں ریاست مدینہ کا دائرہ عمل اس چھوٹے سے شہر تک ہی محدود تھا تاہم اس کی حدود میں بڑی تیزی سے توسیع ہوئی جس کی بڑی وجہ اسلام کا بڑی تیز رفتاری سے پھیلنا تھا تاہم بعض صورتوں میں مفتوحہ علاقوں کو شامل کرنے سے بھی ریاست کے رقبہ میں اضافہ ہوا اس لیے آئینی ڈھانچہ میں ہم آہنگی اور یکسانیت کو پورے طور پر ملحوظ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ شروع شروع میں تمام معاملات مدینہ سے ہی چلائے جاتے تھے تاہم جب ریاست کی حدود بڑھیں اور نئے علاقے ریاست میں شامل ہوئے تو گورنروں کا تقرر کیا گیا۔ بعض جگہوں پر خصوصاً خانہ بدوش قبائل میں سرداروں کے مسلمان ہو جانے پر انہی کو بطور سردار قرار رکھا جاتا اور دوسری صورت میں نیا سردار مقرر کیا جاتا تھا۔ اس طرح مدینہ کی بالواسطہ عملداری قائم رہتی۔ یہ گورنر نمازوں کے امام بھی ہوتے اور ٹیکس کلکٹر بھی (تاہم انہیں علاقائی سطح پر ٹیکسوں کی رقم سے اخراجات کرنے کا بھی اختیار ہوتا تھا) وہ رضا کارانہ فوجی سروس سمیت اسلامی قوانین کے نفاذ کا بھی اختیار رکھتے تھے۔

جب حبشہ کے بادشاہ نجاشی کا انتقال ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھوائی۔ (صحیح بخاری **36/63** - سُہیلی الروض الانف، I، صفحہ **216**)۔ کیا یہ ایک واضح اشارہ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں نجاشی مسلمان تھا؟ مگر ایک قلبی تعلق کی بھی بات تھی لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ حبشہ کی ریاست کا مدینہ

سے کوئی انتظامی تعلق بھی تھا تاہم عمان کے معاملے میں کوئی ابہام نہیں۔ پہلے یہ فارس کے زیر اثر علاقہ تھا جہاں جیفر اور عبد نامی دو بھائی حکمران تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر دونوں بھائیوں نے اسلام قبول کرلیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن العاص کو ان کے پاس اپنا نمائندہ (ریذیڈنٹ) بنا کر بھیجا جو وہاں نہ صرف مسلمانوں کے معاملات نمٹاتے بلکہ ایسے غیر مسلموں کے حقوق کا بھی تحفظ کرتے جو حکمرانوں کے رحم وکرم پر ہوتے۔ اس طریقہ میں نہ صرف مسلمانوں کا بالواسطہ اقتدار قائم ہوا بلکہ اختیارات کی تقسیم بھی عمل میں آئی۔ تاہم ایک اہم پیش رفت یہ تھی کہ عمان کی بڑی بندرگاہ ربا میں جہاں ہر سال ایک بین الاقوامی میلہ لگتا تھا اور جس میں چین، ہندوستان، سندھ کے علاوہ مشرق اور مغرب کے دوسرے ممالک سے لوگ شریک ہوتے، مسلمان گورنر مقرر کیا گیا۔ (ابن المحبر صفحہ 6-265) (بلاذری۔ انساب ا، 529) - بحرین (آج کا صوبہ الحاسہ) میں کوئی بادشاہت نہ تھی مگر فارس کی سلطنت کے عرب گورنر منذر بن ساوہ نے اسلام قبول کرلیا جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ہی بحیثیت گورنر برقرار رکھا۔ اس نے ایران کی سرپرستی کا جوا اتار پھینکا، (میری تصنیف پیغمبر اسلام - بزبان فرانسیسی) جہاں تک نجران کا تعلق ہے وہ ایک عیسائی اکثریتی علاقہ تھا۔ ان کا ایک وفد مدینہ آیا اور جنگ کی بجائے دونوں مذاہب کے جھوٹا یا سچا ہونے کے تعین کے لیے مباہلہ پر اتفاق کیا تاہم بعد میں وہ اس پر بھی تیار نہ ہوئے اور آخر کار ایک معاہدہ کے ذریعے اپنے علاقہ کے اسلامی حکومت سے الحاق پر آمادہ ہو گئے۔ (میری تصنیف الوثائق السیاسیہ 94)۔ انہیں سالانہ جزیہ ادا کرنے کے عوض مکمل مذہبی آزادی عطا کی گئی اور وہ اپنے مذہبی اور سیاسی پیشواؤں کے تقرر میں بھی آزاد تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مطالبے پر اغلباً جج کی حیثیت سے ایک معاملہ فہم شخص (حضرت ابوعبیدہ بن جراح - مترجم) کو ان کے ہاں مقرر فرمایا ایلہ (ایلات)، جربہ اور اذرک بھی جو فلسطین کے عیسائی اکثریت کے خطے تھے جزیہ ادا کر کے اسلامی سلطنت کی پناہ میں آ گئے۔ خلیج عقبہ پر واقع مقنہ نے بھی یہی راستہ اختیار کیا (پیغمبر اسلام - فرانسیسی، الوثائق نمبر 32-34)۔ ضروری نہیں کہ یہاں ان تمام خطوں کی فہرست دی جائے جو اس وقت اسلامی ریاست میں شامل ہو رہے

تھے تاہم جن کا اوپر ذکر آ چکا ہے اس سے ان آئینی پیچیدگیوں کا اندازہ ہوسکتا ہے جو اس ابتدائی مرحلے پر اسلامی مملکت کو درپیش تھیں جبکہ اسلام قبول کرنے کے لیے مدینہ آنے والے وفود کا سلسلہ جاری تھا جن میں غسان (دمشق) کا وفد بھی تھا۔(الوثائق السیاسیۃ نمبر 38-40-ابن سعد، باب وفود) معان (اردن) کے بازنطینی گورنر (فروہ بن عمرو جذامی-مترجم) نے بھی اسلام قبول کرلیا جسے ہرقل کے حکم پر گرفتار کر کے سولی پر چڑھا دیا گیا (ابن ہشام صفحہ 958)۔

مکہ کے ساتھ تعلقات

تکنیکی اہمیت کا ایک اور معاملہ بھی قابل ذکر ہے۔ اوپر مکہ کے حالات میں 10 رکنی کونسل کا ذکر آ چکا ہے۔ ہجرت مدینہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل مکہ سے جنگی معرکے درپیش ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر اور احد دونوں جنگوں میں اسلامی پرچم قبیلہ عبدالدار کے مسلمان ہو جانے والے شخص (مصعبؓ بن عُمیر-مترجم) کے ہی سپرد کیا کہ یہی قبیلہ مکہ میں جنگوں میں علمبرداری کے فرائض انجام دیتا تھا (ابن ہشام صفحہ 432-560)۔ پھر (صلح حدیبیہ کے موقع پر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین مکہ سے مذاکرات کے لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نامزد فرمایا جن کے ذمہ مکہ کی دس رکنی کونسل میں سفارت کاری کی ذمہ داریاں تھیں گو بعد میں ذاتی وجوہ پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے معذرت چاہنے اور اپنی جگہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام تجویز کرنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بات چیت کے لیے مکہ بھیجا۔ (ابن ہشام صفحہ 745)۔ کیا اس حکمت عملی سے یہ مراد لی جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو مکہ کی جلاوطن قانونی حکومت (**de jure**) تصور فرماتے تھے جبکہ مکہ کی برسرزمین حکومت کو بالفعل (**de facto**) کا درجہ دیتے تھے؟

فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمزم کے کنویں کی تولیت حضرت عباس کو اور کعبہ کی چابی بنو عبدالدار کو عنایت فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو بھی تلاش کروایا جن کے خاندان یا قبیلے عرفات اور مزدلفہ میں خدمات کے ذمہ دار تھے تاکہ انہیں ان کی خاندانی ذمہ داریاں سونپی جاسکیں مگر کوئی بھی نہ مل سکا۔ مکی کونسل کی بعض ایسی ذمہ داریاں جو خلاف اسلام تھیں کالعدم قرار دے دی گئیں مثلاً تیروں کے ذریعے فال نکالنا وغیرہ۔

اسلامی ریاست کے تکنیکی پہلو

(سوال یہ ہے کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت آمریت تھی یا جمہوریت یا کسی اور نظام کی نمائندہ تھی؟

یہ آمریت تو ہرگز نہ تھی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر قسم کے معاملات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرماتے تھے حتیٰ کہ نماز کے وقت کے بارے میں لوگوں کو باخبر کرنے کے طریقہ (اذان) جیسے مذہبی نوعیت کے معاملہ پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھیوں سے مشورہ فرمایا۔ (ابن ہشام صفحہ 347)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فرماتے کہ وہ جو کچھ مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں اس پر عمل کے خود بھی اسی طرح پابند ہیں جس طرح دوسرے مسلمان۔ بلکہ جہاں نماز روزہ کی نفلی عبادات کا تعلق ہے انہیں عام مسلمانوں سے زیادہ اہتمام کرنا پڑتا۔ قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے کہ اگر رسول (محمد) قرآن پاک کی بجائے کچھ اور چیز ہم سے منسوب کر کے آپ تک پہنچاتے تو ہم ان کو سخت سزا دیتے۔ قرآنی الفاظ یہ ہیں "یہ (قرآن) تو رب العالمین کا اتارا ہوا ہے اور اگر یہ (پیغمبر) ہم پر کوئی بھی بات بنا لیتا تو البتہ ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے پھر اس کی شہ رگ کاٹ دیتے پھر تم میں سے کوئی بھی مجھے اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔" (69/43-47)

ایک اور مقام پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (قرآن میں صراحت نہ ہونے کے

باعث) صحابہ کے مشورے سے ایک فیصلہ کیا تو اللہ کو یہ فیصلہ پسند نہ آیا تو اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ اور اصلاح کے لیے آیات نازل فرمائیں (8/68)۔ قرآن پاک میں اس نوعیت کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنے آپ کو قانون سے بالاتصور نہیں فرمایا اور کم از کم درجن بھر ایسے واقعات ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی ذات کے خلاف بھی شکایات سنیں اور شکایت کنندہ کو مطمئن کیا چاہے وہ مسلم تھا یا غیر مسلم۔ (ملاحظہ ہو میری تصنیف Muslim Conduct of State چوتھا ایڈیشن صفحہ 257)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسم کے اپنے معاملات ثالثی کے لیے تیسرے فریق کے سپرد کرنے کی مثالیں بھی ہیں۔ (ایضاً 295)

تعدد ازدواج کے بارے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کے اس حوالے سے عام مسلمانوں کے بارے میں دیئے گئے اصول اور قانون کی پابندی کی (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دراصل چار بیویوں پر ہی قناعت کی اور جو بیویاں تحدید ازدواج کے قرآنی حکم سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حبالۂ عقد میں آچکی تھیں ان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازدواجی تعلقات منقطع کر لئے تھے)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت جمہوریت بھی نہ تھی کیونکہ حتمی فیصلہ یا اختیار اعلیٰ کا تعلق عوام یعنی انسان نہیں اللہ کے پاس تھا۔ کسی بھی معاملے پر پہلا رجوع قرآن سے ہوتا تھا جسے کوئی انسان تبدیل کر سکتا ہے نہ ردوبدل تاہم قرآن پاک میں کسی مخصوص معاملے پر واضح حکم نہ ہونے کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی فہم وفراست اور دلائل کا سہارا لے کر فیصلہ فرماتے۔ بعض اوقات صحابہ کرامؓ سے بھی مشورہ کرتے اور بعض اوقات تنہا غور وفکر کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچ جاتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دیرینہ روایات کو بھی برقرار رکھا اور قابل اصلاح ہونے کی صورت میں اس میں مناسب تبدیلی کے بعد اسے جاری وساری رکھا۔ (قرآن کے بعد) انسانی فہم وفراست کو بہرحال ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ قرآن میں احکام ضرور دیئے گئے مگر قرآن کی تشریح وتوضیح کا انحصار انسانی فہم پر تھا اور قرآن کی خاموشی کی صورت میں مسائل کا حل دلائل و براہین سے تلاش کیا جاتا تھا مگر جب واضح قرآنی حکم آجاتا تو پھر انسانی عنصر کو کلیتاً خارج تصور کیا جاتا۔ یہ

مسلمہ اصول سادہ اور منطقی ہے کہ کوئی ادنیٰ اتھارٹی اعلیٰ اتھارٹی کے نافذ کردہ قانون کو کالعدم قرار دینے کا اختیار نہیں رکھتی۔ اگر ایک عام مسلمان مثلاً کوئی جج قانون بناتا ہے تو وہ خود یا اللہ کا رسول اسے ختم کر سکتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا قانون لایا جا سکتا ہے لیکن اگر قانون پیغمبر نے بنایا ہے تو اسے کوئی عام مسلمان تبدیل نہیں کر سکتا تاہم خود پیغمبر اسے تبدیل کر سکتے ہیں یا اللہ تعالیٰ وحی بھیج کر اسے بدلنے پر قادر ہے لیکن اگر حکم اللہ کا ہے تو اسے بدلنے کا اختیار پیغمبر کے پاس بھی نہیں صرف اللہ خود اگر چاہے تو اسے تبدیل کر سکتا ہے اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری پیغمبر ہونے کے باعث وحی موقوف ہو چکی ہے اور اس طرح کسی مسلمان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوئے بغیر قرآنی احکام میں کوئی ردوبدل کر سکے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ پرانا قانون اس وقت تک مؤثر اور قابل عمل رہے گا جب تک قانون ساز اسے تبدیل نہ کر دے۔

پھر کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نظام حکومت تھیوکریسی (اللہ کے اقتدار اعلیٰ پر مبنی) تھی۔ تھیوکریسی کی اصطلاح لفظاً دلکش ہے لیکن تاریخی پس منظر کے ساتھ اس کی ایسی اہمیت نظر نہیں آتی۔ قدیم یہودی تھیوکریسی میں ان کے سربراہ جو ''منصف'' کہلاتے تھے انہیں وحی کی صورت میں خدائی رہنمائی میسر تھی۔ اسلام میں یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک محدود تھی جب کہ خلفاء کو یہ سہولت میسر نہ تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تمام سیاسی۔ سماجی (Civil) اور مذہبی معاملات حکومت کے دائرہ کار میں شامل ہوتے تھے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے ابھی دیکھا کہ فیصلوں میں قابل ذکر حد تک انسانی فہم و ادراک بھی کارفرما ہوتی تھی بشرطیکہ قرآن اس مخصوص معاملے پر خاموش ہو۔ انسانی معاملات کو تین درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (i) سیاسی اور سماجی نوعیت کے معاملات (Civil) (ii) مذہبی (iii) روحانی ۔مغرب میں روحانیت کو مذہب کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے جبکہ اسلام میں مذہب کو سیاسی (سول) معاملات کے جزو لاینفک کی حیثیت حاصل ہے (یعنی مذہب اور سیاست ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ مترجم) اور سیاسی قیادت کو ہی مذہبی اتھارٹی کی حیثیت حاصل ہوتی ہے جبکہ روحانی معاملات کی قیادت کچھ دوسرے لوگوں یعنی خلفائے روحانیت یا امامان طریقت کے سپرد ہوتی ہے۔ اپنی تصنیف ''کتاب الام'' میں

امام شافعی ''خلیفہ'' کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہ خلیفہ کون ہوسکتا ہے اور اس منصب کے آئینی تقاضے کیا ہیں لکھتے ہیں کہ ''مسجد میں امامت کے منصب پر فائز شخص قلعہ (فوج) اور گورنمنٹ ہاؤس (دارالامارہ) میں بھی قیادت کی ذمہ داریوں کے اہل ہونا چاہیے تاہم اسے ان دونوں شعبوں میں قانون یعنی قرآن کی پابندی کرنا ہوگی (کتاب الام I، صفحہ 136-140، 143-144 باب الائمۃ الاعظمی)۔ ہماری عاجزانہ رائے میں اسلامی آئینی نظریات کو مستند بنانے کے لیے ان تمام اصطلاحات کو نظرانداز کردیا جائے جو سرزمین عرب کے مخصوص ماحول اور اس وقت کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر وضع کی گئیں (Foreign Terms) چاہے ان کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے ہو یا خلفائے راشدین کے دور سے اور انہیں اپنی نوعیت کے منفرد حیثیت (اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق) کے حامل ہونے کے حوالے سے تصور کیا جائے۔

سیاست اور روحانیت کو الگ الگ رکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم ریاست کے اندر بیک وقت دو متوازی ریاستیں وجود میں آگئیں تاہم یہ باہم متصادم ہونے کی بجائے ایک دوسرے کی مددگار رہیں۔ بیرونی ریاست کی قیادت سیاسی- مذہبی اتھارٹی کے حامل خلیفہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی جو نہ صرف ملک کے بیرونی دفاع اور اندرونی نظم ونسق اور امن و امان کے قیام کا ذمہ دار ہوتا تھا بلکہ مذہب (اسلام) کے تمام اہم معاملات کی نگرانی بھی اس کی ذمہ داری ہوتی تھی (کیونکہ خلیفہ وقت ہی مسجد میں نمازوں کی امامت کرواتا اور رمضان المبارک کے آغاز اور اختتام کا فیصلہ کرتا۔ حج بیت اللہ کی خود قیادت کرتا یا اپنے نائب کو اس کے لیے نامزد کرتا اور قرآن کے تمام دیوانی، فوجداری اور بین الاقوامی قوانین کا نفاذ کرتا تھا)۔ خلیفہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین کا درجہ حاصل تھا اور اسے بھی اپنے پیشرو جیسے اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ سلم کے جانشین مقرر ہوئے۔ ایک سے زیادہ سربراہ بنانے کی تجویز قبول نہ کی گئی (صحیح بخاری 5/62، نمبر 9 تاریخ طبری I، 1823- ابن سعد III، 151 دیاربکری (تاریخ الخمیس II، 168-169)۔ پوری اسلامی دنیا کے لیے ایک ہی لیڈر کا انتخاب کیا گیا۔ یہ ایک طرف کی صورتحال تھی جبکہ عین اسی

وقت دوسریؒ طرف ایک اندرونی خلافت بھی تھی جو مسلمانوں کی روحانی رہنمائی کے لیے تھی اور اس کے خلفاء کی تعداد پر کوئی پابندی نہ تھی۔ یہ منصب ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور کئی دوسرے صحابہ کرام کو بیک وقت حاصل تھا۔ قادریہ، سہروردیہ وغیرہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ تسلیم کرتے ہیں جبکہ نقشبندیہ والے یہی علم ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حاصل کرتے ہیں۔ تاہم بیک وقت ایک سے زیادہ سلسلوں سے بھی وابستگی رکھی جا سکتی ہے مثلاً مجاہدیہ والے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں سے فیض حاصل کرتے ہیں انہیں بیک وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین گردانتے ہیں۔ ان ''اندرونی خلفاء'' نے اخلاقیات کی ترویج کے علاوہ سچی اسلامی یکجہتی، انسانی بھائی چارہ، تحمل، برداشت کے فروغ اور صدقات و خیرات کی کثرت کو اپنی تعلیمات کا محور بنایا۔ انہوں نے مہم جوؤں کی خواہشات کو دبانے اور بغاوتوں اور خانہ جنگیوں کو بالکل ابتدا میں ہی ختم کرنے میں بہت مفید خدمات انجام دیں۔ سیاسی قیادتوں نے بھی ان روحانی خلفاء سے نیازمندی میں کبھی اپنی توہین نہیں سمجھی بلکہ وہ انہیں اپنے سے برتر ہی تصور کرتے تھے۔

آئینی قانون پر بحث میں اہمیت ہیئت کو نہیں بلکہ اس میں کارفرما روح کو حاصل ہوتی ہے۔ خلفاء کے نزدیک انصاف اور قانون کی عملداری کو اس سوال سے زیادہ اہمیت حاصل تھی کہ آیا ان کا نظام جمہوری ہے یا آمرانہ، یا کہ انہیں اپنی شوریٰ کے اکثریتی فیصلے کو رد کرنے کا اختیار حاصل ہے یا نہیں اور آیا ارکان شوریٰ منتخب ہیں یا نامزد بلکہ ان کے نزدیک اس بات کی اہمیت تھی کہ وہ مختلف طبقات کے نمائندہ ہوں دیانت دار اور فہم و فراست سے بہرہ ور، ذاتی یا مخصوص مفادات کے پیچھے بھاگنے والے نہ ہوں بلکہ اجتماعی فلاح کے علمبردار ہوں۔

اپنی علمی کم مائگی کی بنا پر ہمارے لیے یہ واضح طور پر کہنا ممکن نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین نے ویٹو کا حق استعمال کیا تھا یا نہیں۔ جہاں تک رسول اللہ کا معاملہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تخصیص حاصل تھی کیونکہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ ''اللہ کا حکم یہ ہے'' تو مزید بحث کی گنجائش ہی نہ تھی اور ہر مسلمان اس پر

سر تسلیم خم کر دیتا۔مگر جہاں وحی کا معاملہ نہ ہوتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذاتی، انسانی رائے پر انحصار کرنا ہوتا تو ایسی مثالیں ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رائے پر اکثریت کی رائے کو ترجیح دی۔ مثلاً جنگ احد کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثریت کی رائے کو تسلیم کرتے ہوئے کفار سے لڑنے کے لیے مدینہ سے باہر احد کے مقام پر تشریف لے گئے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہر کے اندر رہ کر دفاع کرنے کے حق میں تھے بلکہ اس ضمن میں ایک حدیث بھی روایت کی جاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اگر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ متفق ہیں تو میں ان کی رائے کے خلاف کام نہیں کروں گا۔'' (تفسیر ابن کثیر ا، صفحہ 420 (تشریح قرآن 3 / 159 بحوالہ ابن حنبل))

اس اصول کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے ''فرمان کا بجالانا اور اچھی بات کہنا پھر جب کام مقرر ہو جائے تو اگر اللہ کے ساتھ سچے رہیں تو ان کے لیے بہتری ہے'' (اطاعت اور فرمان بجالانے کا وعدہ پورا کرو) (47 / 21)۔ بحث کے دوران مخلصانہ اور آزادانہ رائے دینی چاہیے تاہم فیصلہ ہو جانے کے بعد اس کے ساتھ مکمل یکجہتی اور تعاون ہونا چاہیے چاہے فیصلہ رائے کے خلاف ہی ہوا ہو۔ اس میں کسی انا پرستی کو دخل نہیں ہونا چاہیے اور قومی مفاد کو سب سے زیادہ اہمیت دینی چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ووٹنگ کا رواج نہ تھا تاہم صرف ایک مثال ملتی ہے جب جنگ ہوازن کے بعد بعض مسلمان (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک پر) اپنے جنگی قیدیوں (غلاموں) کو آزاد کرنے پر تیار ہو گئے تاہم بعض کو تامل تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا تو دو کے سوا سب نے (جنگی قیدی واپس کرنے کی) حمائت کی جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ تمام قیدی چھوڑ دیئے جائیں اور جو دو شخص مخالف ہیں انہیں ان کے قیدیوں کے عوض سرکاری خزانہ سے معاوضہ دے دیا جائے۔ (الکتانی، الترتیب الدریہ ا صفحہ 235 بحوالہ بخاری کتاب مغازی باب 56، کتاب احکام باب 26)۔ یہ نظام خلفائے راشدین کے دور میں بالکل انہی خطوط پر جاری رہا جس کی تفصیلات آگے آرہی ہیں۔ اس میں آمریت کو کوئی دخل نہ تھا قانون کی عملداری کو بنیادی اصول کی حیثیت حاصل تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت کوئی صاحبزادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت سنبھالنے کے لیے موجود نہ تھا صرف صاحبزادی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے مسئلہ پر بعض صحابہؓ پریشان تھے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی صاحبزادے حیات ہوتے تو شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثار بغیر کسی ہچکچاہٹ اور پریشانی کے انہیں ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین بنا دیتے اور مسلمانوں میں بھی خاندانی حکومت کو قانونی حیثیت حاصل ہو جاتی۔ جہاں تک صاحبزادی کا تعلق ہے قرآن نے عورت کی حکمرانی کی ممانعت نہیں کی اور بہت سے متقی مسلمان فقہاء نے ملکہ سبا کا حوالہ بھی دیا ہے جو قرآن کے مطابق سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ پر مسلمان ہوگئی تھی (27 / 44) (جنہیں اسلام پیغمبر قرار دیتا ہے)۔ عرب روایات بھی اس کے خلاف نہیں جاتیں۔ قبیلہ غطفان کی ام قرفہ اور ام زمل اور قبیلہ تمیم کی سجاح خاتون سرداروں کی معروف مثالیں ہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ورقہ کو جو حافظ قرآن تھیں مدینہ کی ایک مسجد میں امام مقرر کیا تھا جہاں وہ مرد و خواتین مقتدیوں کی امامت کرواتی تھیں۔ (مسند ابن حنبل VI صفحہ 405، ابو داؤد کتاب 2، باب 62 ابن عبدالبر الاستیعاب باب کناء النسا، نمبر 107)۔

تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورت کی ''حاکمیت اعلیٰ'' کے حق میں نہ تھے۔ اپنے وصال سے کچھ عرصہ قبل جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا کہ ایرانیوں نے عورت کو حکمران بنالیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو قوم اپنے معاملات عورت کے سپرد کر دے وہ فلاح نہیں پائے گی''۔ اس کے علاوہ قرآن کا بھی فیصلہ ہے کہ عورتیں جنگ کے لیے موزوں نہیں۔ (13 / 18) (اس آیت میں اس موضوع کا تذکرہ نہیں۔ واللہ اعلم مترجم)

اور اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی کوئی سیاسی خواہش ہوتی بھی تو اس بات کا امکان

کم تھا کہ وہ اپنے عظیم المرتبت باپ جو پیغمبر تھے کی جانشینی کا حق حاصل کر سکیں۔ اس لیے بھی کہ خود ان کے شوہر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اس منصب کے امیدوار تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین مرد رشتہ دار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے جبکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سمیت متعدد عم زاد موجود تھے۔ اسلامی قانون وراثت کے مطابق چچا کو وراثت ملتی ہے جبکہ چچا کے بیٹوں کو نہیں ملتی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرض الموت میں مبتلا تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جانشینی کے مسئلے پر کوئی وصیت نہیں کی۔ آئیے ہم جا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے ہیں کہ اگر سیاسی قیادت ہمارے پاس رہنی ہے تو ہمیں معلوم ہو جائے اور اگر نہیں تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے گواہ بن جائیں گے لیکن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انکار کر دیا اور صاف الفاظ میں کہا ''میں نہیں جاؤنگا اس لیے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار فرما دیا تو کوئی شخص بعد میں ہمیں یہ لینے نہ دے گا۔

(صحیح بخاری 64 / 83، نمبر 15 اور 79 / 29، ابن ہشام صفحہ 1011

تاریخ طبری ا، 1823، بلاذری، انساب ا، پیرا 1180)

(یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ کوئی شخص حکمرانی کی وراثت پر یقین نہیں رکھتا تھا)۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود ذاتی خواہش نہیں رکھتے تھے مگر وہ سیاسی ذہن کے آدمی تھے۔ اس واقعہ کے چند روز بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فوراً ایک بار پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پہنچے اور کہا ''تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہونے کا اعلان کر دو میں تمہاری بیعت کروں گا۔ دوسرے میرے پیچھے آ جائیں گے''۔ (بلاذری انساب ا، پیرا 1185)۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس پر بھی انکار کر دیا اور یکطرفہ ذاتی فیصلہ دوسروں پر ٹھونسنے کی بجائے چاہا کہ مسلمانوں کے عام اجتماع میں اس کا فیصلہ کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی جانشینی پر کوئی بھی اعتراض نہیں اٹھائے گا (خاص طور پر انہیں اس کا اطمینان اس لیے بھی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ان کی حمایت کر رہے تھے)۔

انصار مدینہ میں بھی اس مسئلے پر زوردار بحث جاری تھی مگر وہاں اوس اور خزرج کی دیرینہ عداوت بھی کام دکھا رہی تھی اور کوئی فریق نہیں چاہتا تھا کہ خلافت دوسرے کے پاس چلی جائے۔ تاہم خزرج جو قوت اور تعداد کے اعتبار سے بااثر تھے، کے اکابرین ثقیفہ بنی ساعدہ میں جمع تھے اور اس بات پر غور جاری تھا کہ کس طرح دوسرے فریقوں کو ان کے امیدوار کی حمایت پر آمادہ کیا جائے۔ (وہ مدینہ کے اصل باشندے تھے اور ممکنہ طور پر دارالحکومت مدینہ میں ان کی اکثریت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ملک میں پناہ لی تھی اور ان سے رشتہ داری بھی تھی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کی والدہ کا تعلق خزرج قبیلہ سے تھا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے میزبان بھی بنے تھے۔ اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت عقبہ کے موقع پر نامزد ہونے والے نقیب کے انتقال پر قبیلے کا نقیب بننے پر رضامندی ظاہر فرمائی تھی) (ابن ہشام صفحہ 346، تاریخ طبری ا، 1261، بلاذری کی انساب ا، 254، پیرا584 میں کہا گیا ہے کہ "یہ شخص اسد بن زرارہ نہ صرف قبیلہ بنونجار کا نقیب تھا بلکہ نقیب النقبا بھی تھا یہ وہی خاندان تھا جس سے عبدالمطلب کی والدہ کا تعلق تھا")

ثقیفہ بنی ساعدہ کی سرگرمیوں کی اطلاع اوس کے ایک شخص نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دی جنہوں نے اسے بڑی سنجیدگی سے لیا (ابن ہشام صفحہ 1016) اور دوسرے اکابر صحابہ کو ساتھ لینے کا انتظار کئے بغیر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہمراہ لے کر جو اس وقت ان کے پاس ہی تھے ثقیفہ بنی ساعدہ چلے گئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ خزرجی انصار کو جانشینی کا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد مبارک کی تدفین تک مؤخر کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کریں گے اور اس کے بعد تمام مسلمانوں کو جمع کر کے یہ معاملہ طے کیا جائے گا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جا کر اس سے قبل کہ کوئی انہیں کچھ کہتا اپنا تعارف کرایا۔ انصار نے خلافت پر اپنا حق جتلایا اور اس کے حق میں دلائل پیش کیے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ اگر خلیفہ اہل مکہ میں سے نہ ہوا تو عالم عرب میں اسے احترام حاصل نہ

ہوگا۔ اس پر انصار نے تجویز پیش کردی کہ "ایک امیر تم میں سے اور ایک امیر ہم میں سے" (ایک روایت کے مطابق انہوں نے کہا کہ آج کے بعد سے یہ روایت بنالیں کہ خلیفہ باری باری ہوگا ایک دفعہ مکی پھر مدنی)۔ (صحیح بخاری 62 / 5 نمبر 9، ابن ہشام صفحہ 1016، طبقات، ابن سعد III صفحہ 151) کے مطابق انہوں نے مشترکہ حکومت کی تجویز پیش کی۔ دیار بکر کا II، صفحہ 9-168 کے مطابق خلافت باری باری ہوگی ایک کے انتقال کے بعد دوسرا آئے گا) تاہم اس تجویز پر انصار میں بھی اتفاق نہ تھا اور یہ مسترد کردی گئی۔ ایک انصاری سردار نے اٹھ کر کہا "اہل مکہ سے اقتدار چھیننے کی کوشش نہ کرو کیونکہ آپ سب کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا "الائمته من القریش" (واقدی اور ابن اسحاق کے مطابق یہ الفاظ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہے تھے) اس بارے میں کچھ ابہام ہے۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں آپ کے سامنے دو نام تجویز کرتا ہوں آپ ان میں سے ایک کا انتخاب کرلیں۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ سن کر حیران رہ گئے وہ فوراً اٹھے اور کہا "نہیں میں اس قابل نہیں بلکہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے لیے موزوں ترین ہیں اور آیئے ہم ان کی بیعت کرلیں"۔ انہوں نے چاہا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر بیعت کرلیں مگر انصار کی صفوں سے شور اٹھا کہ "نہیں نہیں پہلے مجھے کرنے دو پہلے مجھے کرنے دو" (انصار کی اسلام کے بارے میں بے لوثی کی یہ کس قدر عمدہ مثال ہے)۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو محض [illegible] توی کرانے آئے تھے فیصلہ کرنے نہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے [illegible] ی اللہ علیہ وسلم کے جسد مبارک کی تدفین کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمام مسلمانوں کو جمع کیا اور ان کو بتایا کہ کس طرح اور کن حالات میں انہیں ان کی مرضی کے خلاف منتخب کرلیا گیا ہے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا "آپ جو کچھ ہوا اس کی تائید [illegible] ے ہرگز پابند نہیں ہیں۔ آپ آزاد ہیں اور آپ چاہیں تو نیا امیر منتخب کرسکتے ہیں" لیکن کوئی بھی پہلا فیصلہ تبدیل کرنے پر آمادہ نہ ہوا اور سب نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ جب اس انتخاب کی خبر اردگرد کے علاقوں اور

صوبوں میں پہنچی تو لوگوں نے اپنے اپنے گورنروں کے ذریعے آپ پر بیعت کر لی۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس اجتماع میں موجود نہ تھے (بعد میں انہوں نے بتایا کہ وہ قرآن جمع کرنے میں مصروف تھے) چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود ان کے پاس گئے اور کہا کہ سب لوگوں نے یہ فیصلہ کیا ہے اس لیے آپ بھی اس کی تائید کریں۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ ''میں ہرگز آپ کے خلاف نہیں لیکن جس چیز پر مجھے اعتراض ہے وہ یہ کہ مجھے اجلاس میں بلائے بغیر یہ فیصلہ کر لیا گیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ کس طرح وہ ثقیفہ بنی ساعدہ میں گئے اور اگر انہیں علم ہوتا کہ وہ (علی رضی اللہ عنہ) خلافت کے خواہش مند ہیں تو وہ کبھی بھی یہ انتخاب قبول نہ کرتے تاہم جلد ہی دونوں میں مصالحت ہو گئی۔ یہاں اس حوالے سے متنازعہ روایات دینے کی ضرورت نہیں کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فوراً بیعت کر لی یا کچھ عرصہ بعد کی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ چند اصحاب نے بیعت سے انکار کر دیا اور کم سے کم ایک (حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عبادہ - مترجم) نے عمر بھر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت نہ کی۔ تاہم جن اصحاب نے بیعت نہیں کی تھی ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہ صرف ان سے کبھی تعرض نہیں کیا بلکہ ان کے احترام میں بھی کمی نہیں کی اور ان لوگوں نے بھی حکومت کے معاملات میں کبھی رکاوٹ نہیں ڈالی بلکہ معاونت کی اور ان تمام جنگی مہمات میں بھی شریک ہوئے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں روانہ فرمائیں۔

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا منصب خلافت تاحیات تھا۔ وہ پیغمبر نہیں تھے اس لیے وحی آنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی جانشین ضرور تھے مگر وہ تمام پیغمبرانہ ذمہ داریوں کے مکلّف نہ ہو سکتے تھے۔ سیاسی اور مذہبی معاملات کی جانشینی تو ''بیرونی

خلیفہ'' کی حیثیت سے انہوں نے سنبھال لی تھی کہ وہ اولین جانشین تھے۔ جہاں تک روحانی معاملات کا تعلق ہے اس پر فرد واحد کی اجارہ داری اور مرکزیت کی ضرورت نہیں تھی اور ایسے صحابہ کرامؓ کثیر تعداد میں موجود تھے جو روحانی ذہن رکھتے تھے اور جنہوں نے براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسب فیض کیا تھا۔ وہ پوری آزادی سے طلب علم کا شوق رکھنے والوں تک پہنچتے اور انہیں علم سکھاتے جو ان کے پاس تھا۔ یہ ''اندرونی خلفاء'' بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین تھے اور ان میں کوئی طبقاتی امتیاز بھی نہ تھا۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمانوں کے ''بیرونی خلیفہ'' تو تھے ہی ان لوگوں کے لیے وہ ''اندرونی خلیفہ'' بھی تھے جنہوں نے انہیں منتخب کیا تھا۔علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ''پہلے'' بیرونی خلیفہ تو نہیں تھے تاہم ان کا شمار اندرونی خلفاء میں ہوتا تھا اور وہ اسی شہر میں ہی مقیم بھی تھے جہاں ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ رہائش پذیر تھے اگر یہ سوچ لیا جائے کہ اس دنیا کی چیزیں عارضی اور فانی ہیں اس لیے ان پر جھگڑا نہیں ہونا چاہیے اور اہمیت دوسری دنیا کو حاصل ہے جو روحانی دنیا کے دائرہ عمل میں ہے تو ممکن ہے مسلمانوں میں اتحاد ہو جائے۔ اس بات پر سُنی اور شیعہ متفق ہیں کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی سلطنت کے جانشین اور وارث تھے (آج کے بیشتر روحانی سلسلے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وابستگی رکھتے ہیں)۔

اس پہلو کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض احادیث سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو سرکاری عہدہ طلب کرے ہم اسے نہیں دیتے۔'' وہ سیاسی خواہشات کی حوصلہ شکنی کرنا چاہتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کو ہی مثال بننا تھا۔علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وقتی طور پر اس کی خواہش کی تھی تاہم بعد میں انہیں خوشی ہوئی ہوگی کہ انہوں نے اس معاملے میں زبردستی نہیں کی اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خواہش

پوری ہوگئی کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی خواہش کے نتیجے میں منتخب نہیں ہوئے۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے فوراً بعد خلافت کے منصب پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتخاب سے خاندانی حکمرانی کے نظام پر مہر تصدیق ثبت ہو جاتی اور مسلمانوں کے لیے جمہوریت یا کسی دوسرے نظام حکومت کا انتخاب آسان نہ ہوتا اور اس طرح اسلام کے پیغام کی آفاقیت اور اس کے قوانین کی لچک پر خاندانی حکمرانی کا نظام اثر انداز ہوتا اور پھر قیامت تک ایک ہی خاندان کی حکومت کو برداشت کرنا ہی مسلمانوں کی مجبوری ہوتا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نامزدگی

اپنے انتقال سے قبل حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے سیکرٹری عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ ان کی (اپنے جانشین کے حوالے سے) وصیت قلمبند کریں۔ انہوں نے لکھوانا شروع کیا کہ ''میں خلیفہ کے منصب کے لیے..........'' انہوں نے یہاں تک لکھوایا تھا کہ ان پر غشی طاری ہوگئی جس کے بعد نیک دل عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ازخود ان کا ادھ کہا جملہ مکمل کیا اور وہاں عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام لکھ دیا (ابن سعد III، صفحہ 142، ابن حنبل I، 27 نمبر 259) تاہم جلد ہی ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوش میں آگئے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کا جملہ مکمل کر دیا ہے تو وہ خوش ہوئے اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعریف کی اور کہا ''آپ اپنا نام بھی لکھ سکتے تھے کیونکہ آپ بھی اس کی اہلیت رکھتے ہیں۔ وصیت کی دستاویز مکمل کرنے کے بعد اسے مہر بند کر دیا گیا اور ''پولیس کمشنر'' کو ہدائت کی گئی کہ وہ اسے باہر لے جا کر عام لوگوں کے سامنے اعلان کر دے۔ کہ: یہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وصیت ہے جو اس بات کے متمنی ہیں کہ انہوں نے جس شخص کا نام خلیفہ کے لیے نامزد کیا ہے آپ اس کی بیعت کر لیں۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا احترام اس قدر تھا اور لوگ ان پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ یہ جانے بغیر کہ بند لفافے میں کس کا نام ہے لوگوں نے ان کی نامزدگی کی توثیق کر دی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتقال کے بعد لفافہ کھولا گیا اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے لوگوں نے ایک بار پھر بیعت کی۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لیے کوئی الیکشن نہیں ہوا اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بادشاہی نظام میں بھی ہر نئے بادشاہ کے ہاتھ پر بیعت تو کی جاتی ہے اس لیے صرف بیعت ہی سے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک جمہوریہ کے ''منتخب'' صدر نہیں بن سکتے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتخاب

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں وہ نظام حکومت تبدیل نہ ہوا جس کا آغاز حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا تھا۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے انتقال تک اپنے جانشین کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ اچانک ایک قاتلانہ حملے میں شدید زخمی ہونے کے بعد وہ جانبر نہ ہو سکے اور خالق حقیقی سے جا ملے۔ انتقال سے قبل انہوں نے کہا: ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس ایسے اصحاب کے نام گنوائے تھے جو یقینی طور پر جنت میں جائیں گے (عشرہ مبشرہ)۔ ان میں سے جو لوگ زندہ ہیں چھ اس وقت مدینہ میں موجود ہیں۔ ان چھ کو بیٹھ کر اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لینا چاہیے۔ انہوں نے ایک ساتویں نام کا اضافہ کر دیا جو فیصلہ نہ ہو سکنے کی صورت میں اپنا ووٹ دے کر فیصلہ کر سکے مگر اس کا نام امیدواروں میں شامل نہیں ہوگا۔ یہ نام ان کے صاحبزادے عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تھا۔

جب ان چھ اصحاب کا اجلاس شروع ہوا تو چار نے امیدوار بننے سے معذرت کر لی اس طرح صرف حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی رہ گئے جن میں سے ایک کو خلیفہ نامزد کیا جانا تھا۔ اس پر سب نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عوف کو اختیار دے دیا کہ وہ حتمی فیصلہ کریں گے۔ انہوں نے کئی روز تک عام لوگوں کی رائے لی اور نہ صرف شہر کے مستقل مکینوں سے مشورہ کیا بلکہ مدینہ آئے ہوئے تاجروں اور مسافروں سے بھی ان کی رائے پوچھی حتیٰ کہ مدارس میں زیر تعلیم بچوں اور عورتوں سے بھی پوچھا (ابن کثیر، البدایہ والنہایہ **VII** صفحہ **146**)۔

انہوں نے اندازہ کیا کہ بھاری اکثریت نے (کہا جا سکتا ہے کہ **99.9** فیصد) حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں رائے دی جبکہ قلیل تعداد میں لوگ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حامی نظر آئے۔ اپنے فیصلے کے اعلان سے قبل انہوں نے ایک بار پھر سب کے سامنے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا: عثمان (رضی اللہ تعالیٰ

عنہ)! اگر میں آپ کو نامزد کروں تو کیا آپ قرآن وسنت کی تعلیمات پر عمل اور ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نقش قدم پر چلنے کے لیے تیار ہیں؟ انہوں نے جواب دیا ''ہاں''۔

جب یہی سوال انہوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ'' قرآن وسنت پر عمل کے بارے میں سوال پر میرا جواب ہے''ہاں'' لیکن ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پالیسیوں پر عمل (ہو بہو) میرے نزدیک ضروری نہیں۔ میں خود اجتہاد بھی کر سکتا ہوں۔'' چنانچہ ان کے جواب کے بعد حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عوف نے کہا'' اے باری تعالیٰ تو سب سے زیادہ جانتا ہے کہ مجھے صرف تمہارے بندوں کی بہتری عزیز ہے'' اس کے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ وہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ نامزد کرتے ہیں (یہ بھی ایکشن نہیں تھا بلکہ ایک نامزدگی تھی گو براہ راست نہیں بلکہ مشاورت کے ذریعے بالواسطہ طور پر)۔اس موقع پر بھی صوبوں نے دارالحکومت میں ہونے والے فیصلے کی تائید کر دی۔

علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

عظیم مؤرخ طبری کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رسوائی اور شہادت کا منصوبہ بہت پہلے غیر مسلموں نے تیار کیا تھا جو حکمت عملی سے آگے بڑھایا گیا اور بہت کامیابی سے تکمیل تک پہنچایا گیا۔(نظر ثانی 33 ہجری۔ بمتعلق ابن سبا المعروف ابن السودا) کچھ سادہ لوح مسلمان بھی غیر ارادی طور پر سازشیوں کے بھرے میں آگئے۔ تفصیلات میں جائے بغیر آیئے ہم اس سانحہ کے آخری مرحلے کا جائزہ لیتے ہیں۔ غلط یا صحیح گورنر مصر کے خلاف کچھ شکایات سامنے آئیں اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فوراً ہی انہیں تبدیل کر کے اس شخص کو گورنر بنانے پر آمادہ ہو گئے جس کا نام شکایت کرنے والوں نے تجویز کیا تھا۔ یہ نام حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے کا تھا۔ اپنی تقرری کا

پروانہ حاصل کرتے ہی وہ مصر کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک الگ خط گورنر مصر کے نام بھی بھیجا جس میں انہیں مطلع کیا گیا کہ ان کی جگہ فلاں کو گورنر بنایا گیا ہے اور وہ نئے گورنر کی آمد پر چارج ان کے حوالے کر دیں۔ سرکاری ڈاک لے جانے والے ہرکارے نے تیز رفتاری سے سفر کیا تا کہ وہ نامزد گورنر سے قبل مصر پہنچ کر خط حوالے کر سکے۔ دریں اثناء جب اس نے نامزد گورنر (کے قافلے) کو پیچھے چھوڑا تو نامزد گورنر کو اس کی تیز رفتاری کے حوالے سے خط کے مندرجات پر شبہ ہو گیا۔ انہوں نے سرکاری ہرکارے سے خط لے کر کھول لیا اور پڑھا جس میں لکھا تھا کہ ''فلاں بن فلاں کو گورنر مصر مقرر کیا جاتا ہے اور آگے لکھا تھا فا قبلہ یعنی آپ انہیں خوش آمدید کہیں۔ مگر چونکہ عربی رسم الخط ابھی تحریر میں بہت زیادہ مستعمل نہیں تھا اس لیے الفاظ کی بناوٹ اور نکات کی ترتیب کا زیادہ دھیان نہیں رکھا جاتا تھا۔ یہ لفظ اس انداز میں لکھا گیا تھا کہ اس پر فاقتلہ کا بھی گمان ہو سکتا تھا جس کے معنی تھے کہ اسے قتل کر دو۔

اس واقعہ کا راوی مصر کا معروف مؤرخ سیوطی ہے (تضریب الروی صفحہ 151)۔ سیوطی لکھتا ہے کہ ''یہ ایک المیہ تھا کہ نامزد گورنر نے شبہ کی بنا پر خط پڑھا اور اس سے غلط معنی اخذ کیے اور برافروختہ ہو کر مدینہ واپسی کی راہ لی اور دارالحکومت پہنچ کر طوفان کھڑا کر دیا۔ خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قسم اٹھا کر کہا کہ ان کے حکم نامہ میں خوش آمدید کہنے کی ہدائت تھی قتل کرنے کی نہیں لیکن ان کی تمام یقین دہانیاں بے اثر ثابت ہوئیں''۔ اسی اثناء میں سازشیوں نے مصر سے ایک فوج مدینہ میں گڑبڑ پھیلانے کے لیے بھیج دی۔ خلیفہ کے پاس اتنی قوت تھی کہ وہ باغیوں کو آسانی سے کچل سکتے تھے لیکن وہ اپنی سادہ دلی اور نرم طبیعت کے باعث اس سازش کو نہ بھانپ سکے اور انہوں نے مدینہ میں متعین فوج کو بھی حج پر جانے کی اجازت دے دی اور اپنی حفاظت کے لیے گورنر شام کی فوج بھیجنے کی پیشکش بھی شکریہ کے ساتھ لوٹا دی۔ مدینہ میں خلیفہ کے خلاف کوئی عمومی معاندانہ جذبات موجود نہ تھے اس لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہی کافی سمجھا کہ اپنے صاحبزادوں حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ کے گھر بھیج دیا تا کہ گھر پر سامنے سے حملہ نہ کیا جا سکے مگر سازشی اپنے منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ

عقبی دیوار سے خلیفہ کے گھر کے اندر کود گئے اور روزہ دار خلیفہ کو قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے شہید کر دیا۔ حملہ آوروں نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ محترمہ کو بھی زخمی کر دیا جو اس وقت اکیلی آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تھیں۔

جنگ جیتنا بہت آسان ہے مگر امن قائم کرنا آسان نہیں۔ شہادت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد باغی آنے والے حالات سے خائف ہو کر اور اپنے قبیح فعل کو جواز بخشنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے اور ان سے استدعا کی کہ وہ اپنی خلافت کا اعلان کر دیں اور ان کی بیعت بھی قبول کریں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہلے انکار کیا اور کہا

''مجھے چھوڑ دو اور کسی اور کو تلاش کرو کیونکہ آگے اندھیرا ہے اور معاملات الجھ گئے ہیں۔ یہ بات جان لو کہ اگر میں نے تمہاری بات مان لی تو میں تمہیں اس طرف لے جاؤں گا جو میرے نزدیک درست ہو گا اور میں سچ کے خلاف کوئی سفارش یا ہمدردی کی بات نہیں سنوں گا۔ سچ یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو امیر کی بجائے وزیر دیکھنا بہتر سمجھتا ہوں۔''

(الشریف الرضی، نہج البلاغہ I صفحہ 182 خطبہ نمبر 88)

باغیوں نے کئی اور لوگوں کو بھی خلافت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی بھی معصوم خلیفہ کی شہادت کا الزام اپنے سر آنے کے خدشہ کے باعث یہ ذمہ داری سنبھالنے پر تیار نہ ہوا۔ چنانچہ باغی پھر پلٹ کر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئے اور اتنا اصرار کیا کہ آخر کار وہ آمادہ ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو اکابر صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے جنہوں نے دوسرے لوگوں کے ہمراہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی استدعا کی تھی، کہا ''بخدا مجھے خلافت کی کوئی خواہش نہیں اور بادشاہت کی میری نظر میں ذرا سی بھی اہمیت نہیں یہ آپ ہیں جو مجھے مجبور کر رہے ہیں اور دھکیل کر ادھر لا رہے ہو۔'' (نہج البلاغہ II صفحہ 210، خطبہ نمبر 200)

خلیفہ بننے کے بعد علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس اپنی کوئی فوج نہ تھی اور وہ عملاً مسلح باغیوں کے دست نگر تھے۔ مدینہ میں متعین سرکاری فوج فریضہ حج کے لئے مکہ گئی ہوئی تھی۔ جب شہادت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خبر صوبائی دارالحکومتوں میں پہنچی تو وہاں غم و

اندوہ کی لہر دوڑ گئی اور یہ مطالبہ شدت اختیار کر گیا کہ قاتلین عثمان کو سزا دی جائے۔ فطری طور پر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قریبی رشتہ دار اس مطالبے میں پیش پیش تھے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اس حوالے سے دباؤ بڑھ رہا تھا مگر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بے بس تھے۔ وہ مطالبہ کرنے والوں کو صبر و تحمل سے کام لینے کی تلقین کرتے اور کہتے کہ کچھ انتظار کریں کہ وہ آزادی عمل کے قابل ہو جائیں۔ اسی کیفیت میں ان سے کچھ سیاسی غلطیاں بھی سرزد ہوئیں۔ وہ مدینہ چھوڑ کر عراق چلے گئے (ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ مصری باغیوں کی ''حفاظت'' سے بھی آزاد ہو سکیں گے) انہوں نے بعض گورنروں کو بھی معزول کر دیا جن میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شامل تھے جو شام میں متعین اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ اسی اثناء میں طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود خلافت کے حصول کی کوششیں شروع کر دیں اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو سیاست میں عملی حصہ لینے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتلوں کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کیا۔ ان کے ساتھ بڑی تعداد میں فوج جمع ہو گئی۔ اس نئی صورتحال سے نمٹنے کے لئے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی تیاری شروع کر دی تاہم چونکہ ابھی اکابر صحابہؓ اور مخلص مسلمانوں کی کمی نہ تھی اس لئے مسئلے کے پُرامن حل کے امکانات موجود تھے۔ کسی شخص کو بھی یہ اختلاف نہ تھا کہ ان حالات میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی خلافت کے لئے موزوں ترین شخص تھے۔ چنانچہ مذاکرات کے بعد سمجھوتے پر اتفاق ہو گیا۔ مگر ایک غیر مسلم (یا منافق) ابن سبا کی سازش رنگ لائی کہ اس کے آدمیوں نے رات کی تاریکی میں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فوج کے کیمپ پر حملہ کر دیا اور یہ انداز اختیار کیا کہ گویا حملہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے کیمپ سے کیا گیا ہے۔ (طبری، نظر ثانی 41 ہجری) اس غلط فہمی کی بنا پر مشہور جنگ جمل شروع ہو گئی۔ جنگ میں طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہو گئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قیدی بنا لی گئیں تاہم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انتہائی احترام سے انہیں واپس مدینہ بھجوا دیا۔ بعد میں جب انہیں حقائق سے آگاہی ہوئی تو انہیں (اپنے اقدام پر

شدید پچھتاوا ہوا اور یہ صدمہ عمر بھر انہیں کچوکے دیتا رہا۔

جنگ جمل کے خاتمے کے بعد بھی جس میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حریفوں پر فتح حاصل ہوئی حالات درست نہ ہوئے۔ اب انہیں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قیادت میں شامی فوج کا سامنا تھا۔ حالات بالآخر جنگ صفین پر منتج ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں خطوط کا تبادلہ ہوا۔ یہ خطوط ''نہج البلاغۃ'' میں محفوظ ہیں اور عظیم آئینی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اہل تشیع کا یہ دعویٰ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کبھی بھی اس فیصلہ کن اور ناقابل تردید دلیل کا حوالہ نہیں دیا۔ اگر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے دوران اپنا دعویٰ خلافت پیش نہ کرتے تو کہا جا سکتا تھا کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قربانی دی اور دنیاوی مناصب کو ذرا سی بھی اہمیت نہیں دی مگر جب انہوں نے نہ صرف خلافت کا دعویٰ کیا بلکہ اس کے حصول کے لئے خصوصاً معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف فوج کے استعمال سے بھی گریز نہ کیا مگر اس سارے عمل کے دوران کبھی بھی اس فیصلہ کن دلیل کا سہارا نہیں لیا تو اس سے اس تاثر کو تقویت ملتی ہے کہ یہ دعویٰ بعد میں تخلیق کیا گیا۔ درحقیقت اپنے خطوط میں جن کا حوالہ نہج البلاغۃ میں جو شیعہ مکتب فکر کی نمائندہ کتاب ہے، دیا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صرف اس نکتہ پر اصرار کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار ہیں اور ماضی میں اسلام کے لئے ان کی خدمات اپنے حریف سے زیادہ ہیں (نہج البلاغہ III، 8، نمبر 6) مگر کسی جگہ انہوں نے یہ دلیل پیش نہیں کی کہ انہیں رسول اللہ نے اپنا جانشین نامزد فرمایا تھا۔

فرض کریں کہ نہج البلاغہ میں وہ خط ہی غائب کر دیا گیا یا خط کا وہی حصہ حذف کر دیا گیا جس میں وہ دلیل مذکور تھی (جس کا امکان بہت کم ہے) تو ہم اس دلیل کا ہی جائزہ لے لیتے ہیں جو بعد کے مورخوں نے شامل کر دی ہے۔ اس دلیل کی بنیاد دو واقعات ہیں۔

1. اسلام کے ابتدائی ایام میں ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان کا ایک اجلاس بلوایا اور اس میں فرمایا: جو میرا دین قبول کرے گا وہ میرا جانشین ہو گا۔ صرف علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (آپ کا ساتھ دینے کیلئے) کھڑے ہوئے جو اس وقت کمسن لڑکے تھے۔ حاضرین میں سے بعض نے مذاق اڑانے کے انداز میں حضرت ابوطالب سے کہا: اب تم اپنے چھوٹے بیٹے کے پیچھے چلنا۔ (تاریخ طبری I، 1183-4)۔

2. اپنی حیات مبارکہ کے آخری مہینوں میں حج الوداع سے واپسی پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جھیل خم پر قیام فرما تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ دوسرے فوجی سپاہیوں کے ساتھ ایک تنازع میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حمائت کی اور فرمایا تھا "جس کا میں مولیٰ ہوں، علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اس کا مولیٰ ہے۔" (ابن حنبل I، 118، 119، 152، IV، 281، 368، 370، 372، 370V)۔

بعض دوسری روایات میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اسلام قبول کرنے کا واقعہ بالکل مختلف انداز میں آیا ہے (طبری I، 1164-5) تاہم ہم مذکورہ بالا روایت کو ہی درست تسلیم کر لیں تو کیا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ اور لوگ اسلام قبول کرنے کا اعلان نہیں کر سکتے تھے؟ اگرچہ ایسا ہوا نہیں لیکن فرض کریں کہ اور لوگ بھی اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیتے تو کیا وہ سب ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی جانشین بن جاتے؟ اور یہ حقیقت بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی سیاسی قوت نہ تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی ریاست یا مملکت نہ تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف روحانی سلطنت کے مالک تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کے مالک تھے جانشینی کے لئے اسی کو ہی پیش کر سکتے تھے اور یہی بات قرین قیاس نظر آتی ہے کہ اس سلطنت کے لئے کسی قسم کے حسد کی گنجائش نہ تھی اور اس میں بیک وقت کئی بادشاہ اور خلفاء۔ آقا اور استاد کی نیابت کر سکتے تھے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا مسلمانوں نے سیاسی- مذہبی قیادت اور روحانی سلطنت کو ایک

دوسرے سے الگ رکھا ہے اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روحانی بادشاہت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ تھے جیسا کہ قادریہ اور دوسرے سلسلوں کے پیروکار تسلیم کرتے ہیں۔ تمام سنی بھی اسے مانتے ہیں اور غزوہ تبوک کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مشہور فرمان بھی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا ''کیا تمہیں میرے ساتھ وہی رشتہ پسند نہیں جو ہارون علیہ السلام کا موسیٰ علیہ السلام سے تھا''۔ اس حقیقت کی ہی توثیق کرتا ہے (ابن ہشام صفحہ 897)۔ درحقیقت موسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں کے سیاسی، قانونی اور انتظامی معاملات کا نگران بنایا گیا تھا جب کہ ہارون علیہ السلام کو عقیدہ اور مذہب سے متعلق امور سونپے گئے تھے۔

جہاں تک دوسری دلیل کا تعلق ہے کیا 'مولیٰ' سے مراد جانشین لیا جا سکتا ہے۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ قرآن میں یہ اصطلاح متعدد مقامات پر لیکن مختلف معانی کے ساتھ استعمال ہوئی ہے لیکن ایک جگہ بھی موجود حاکم کے ولی عہد یا جانشین ہونے کے معنی میں استعمال نہیں کی گئی۔ قرآن میں اس کا تذکرہ ان معانی میں ہوا ہے۔

1) تم سب کا ٹھکانہ دوزخ ہے وہی تمہاری رفیق (مولیٰ) ہے۔ (15/57)

2) اللہ تعالیٰ تمہارا کارساز (مولیٰ) ہے وہ بہت اچھا کارساز (مولیٰ) ہے اور بہت اچھا مددگار ہے۔ (40/8)۔

3) غلام.......... جو اپنے مالک (مولیٰ) پر بوجھ ہے (76/16)۔

4) ماں باپ یا قرابت دار جو (ورثہ) چھوڑ کر مریں اس کے وارث (موالی۔ مولیٰ کی جمع) ہم نے ہر شخص کے مقرر کر دیئے ہیں۔ (4/33)

5) اگر تمہیں ان (لے پالکوں) کے (حقیقی) باپوں کے ناموں کا علم نہیں تو وہ تمہارے اپنے بھائی اور دوست (موالیکم) ہیں (5/33)۔

6) مجھے اپنے مرنے کے بعد اپنے قرابت داروں (موالی) کا خوف ہے میری بیوی بھی بانجھ ہے پس تو مجھے اپنے پاس سے وارث عطا فرما۔ (5/19)۔

7) اس دن کوئی دوست (مولیٰ) کسی دوست (مولیٰ) کے کام نہیں آئیگا (41/44)

ان سب سے صرف آخری استعمال کا مفہوم ہی جھیل خم کے واقعہ پر منطبق کیا جا سکتا ہے اور اس میں بھی علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو دوست کے معانی میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ''مولیٰ'' قرار دیا گیا یہ نہیں کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ''مولیٰ'' ہوں گے۔

جو اہم دلیل علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام خط میں دی وہ یہ تھی ''جن اصحاب رضی اللہ عنہم نے میری بیعت کی ہے وہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پھر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور پھر عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت کی تھی اور بالکل اسی طریقے سے میری بیعت ہوئی جیسے کہ ان کی ہوئی۔ دوسرے لوگوں (صوبوں) کو مہاجرین اور انصار مدینہ کے فیصلے کو رد کرنے کا کوئی حق ہے نہ اختیار۔

اگر کوئی شخص ان کے فیصلے سے (اختلاف کر کے) باہر جائیگا تو اسے بذریعہ طاقت مومنین کی صفوں میں واپس لایا جائیگا۔ آپ جانتے ہیں میں خون عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بری ہوں اور یہ آپ کا جذباتی پن ہے جو آپ کو اتہام پر ابھار رہا ہے۔''

(نہج البلاغۃ III، 9-138)

مذاکرات کی ناکامی جنگ صفین پر منتج ہوئی تاہم مخلص مسلمانوں کی کوشش سے جنگ بندی ہوئی اور فریقین پر امن ذرائع سے فیصلہ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ہر فریق کو مذاکرات کے لئے اپنا ایک نمائندہ نامزد کرنا تھا اور ان دونوں ثالثوں نے قرآن کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ خلیفہ ہونے کا حق کس کو حاصل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ثالثوں کو مکمل اختیارات حاصل تھے کہ وہ فیصلہ کریں۔ چونکہ مذاکرات کی کارروائی کے کوئی تحریری ثبوت تو ہیں نہیں اس لئے باور کیا جا سکتا ہے کہ دونوں نمائندے دونوں امیدواروں کو معزول کر کے معاملہ عام مسلمانوں پر چھوڑنے پر متفق ہو گئے تھے کہ وہ الیکشن کر کے فیصلہ کر لیں۔ تاہم مکمل یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ معلوم حقائق کے مطابق فیصلہ کے دن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نمائندہ نے اعلان کیا کہ وہ دونوں امیدواروں کو معزول کرتے ہیں اور فیصلہ عام مسلمانوں پر چھوڑتے ہیں کہ وہ نئے الیکشن کے ذریعہ خلیفہ کا فیصلہ کر لیں جبکہ معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نمائندہ نے اعلان کیا کہ وہ معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت

کے لیے توثیق کرتے ہیں کیونکہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نمائندہ کو صرف انہیں ہی معزول کرنے کا اختیار تھا۔ معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی معزولی کا انہیں کوئی اختیار نہ تھا۔ اس صورتحال سے معاملات میں نیا بگاڑ پیدا ہو گیا۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پورا حق تھا کہ وہ فیصلہ کو تسلیم نہ کرتے چونکہ یہ متفقہ نہ تھا۔ دونوں فریق ایک بار پھر صف آرا ہونے کی تیاریاں کرنے لگے لیکن اسی دوران ایک نئی پیچیدگی پیدا ہو گئی۔ شورش پسندوں کے ایک گروہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر حملہ کر کے انہیں شدید زخمی کر دیا۔ معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی حملے میں زخمی ہوئے تاہم وہ بعد میں صحت یاب ہو گئے۔

علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس حملے کے زخموں سے جانبر نہ ہو سکے۔ انتقال سے قبل انہوں نے وصیت لکھوائی: اہل تشیع کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے حسن کو اپنا جانشین مقرر کیا (ابن عبدربہ- العقد الفرید، ایڈیشن بولاق II صفحہ 351 مسعودی نے ''مروج الذہب'' میں انکی تردید کی)۔ تاہم سنی مورخوں کے مطابق انہوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا ''میں نہیں کہتا ہوں کہ حسن کی بیعت کرو نہ اس سے منع کرتا ہوں'' (ابن کثیر، البدایہ VII 327، الحکم، المستدرک III، 79)۔ اگر اہل تشیع کے دعوے کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر اپنے بیٹے کی نامزدگی خلفائے راشدین کی سنت بن جاتی ہے اور اس طرح معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کو جانشین نامزد کر کے گویا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عمل کی پیروی کی تھی (اور یزید اس وقت بُری شہرت بھی نہیں رکھتا تھا۔ سخی تھا۔ ذہین تھا۔ کبھی شراب نہیں پی تھی نہ نماز اور روزے میں غفلت کرتا تھا) (ابن کثیر البدایہ VIII، 233، بحوالہ روایت محمد بن حنفیہ حسن اور حسین کے سوتیلے بھائی)۔

فرق صرف یہ تھا کہ معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یزید کو بستر مرگ پر نہیں بلکہ اس سے کئی سال قبل جانشین نامزد کر دیا تھا اور لوگوں سے کہا تھا کہ وہ اس کی بیعت کریں اور وہ پہلے سے جانتے تھے کہ (معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتقال کے بعد) کیا ہوگا۔ اب سفر کو پھر تھوڑا پیچھے لے جائیں کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتقال کے بعد حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان لوگوں نے جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیروکار تھے متفقہ طور پر خلیفہ تسلیم کر لیا لیکن جلد ہی وہ ہر قسم کے ڈسپلن سے آزاد ہو گئے اور اس طرح شورش پر آمادہ

ہوئے کہ اپنے خلیفہ حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہی خیمہ لوٹ لیا اور وہ خود بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوئے۔ حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس واقعہ سے اتنے دلبرداشتہ ہوئے کہ انہوں نے معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صلح کر لی اور اس شرط پر ان کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے کہ وہ انہیں (حسنؓ) اپنا جانشین نامزد کر دیں گے۔ (ابن کثیر، البدایہ VIII، 41، ابوالفرج اصبہانی، مقاتل الطالبین I، 58) یہ ایک خوشگوار صورتحال تھی اور تاریخ میں اسے ''اتحاد کا سال'' یا ''مصالحت کا سال'' کہا گیا ہے۔ (حسنؓ کا انتقال معاویہؓ سے پہلے ہو گیا اس لئے ان کی جانشینی کی شرط ختم ہو گئی اور جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے معاویہؓ نے امت کے استحکام اور جانشینی کی لڑائیوں سے بچنے کے لئے اپنا جانشین (زندگی میں ہی) نامزد کرنے اور عوام سے اس کی توثیق کرانے کا فیصلہ کیا۔

ہم نے دیکھا کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلیفہ بننے کے معاملے میں کسی حد تک الیکشن کی صورت ہو گئی تھی جو جزوی طور پر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے معاملے سے مشابہت رکھتی تھی۔ معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلافت پیش نہیں کی گئی بلکہ انہوں نے اپنے صوبہ کے لوگوں سے مطالبہ کیا کہ انہیں خلیفہ تسلیم کریں اور چونکہ وہ اپنے صوبے میں بہت مقبول تھے اسلئے عوام نے انہیں رضامندی دے دی اور وہ اپنی فوج اور اپنی سفارتی مہارت کو کام میں لا کر وسیع اسلامی سلطنت کے مقتدر حکمران بن گئے۔ حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے معاملے میں فرقہ وارانہ اختلافات کے باعث پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ اہل تشیع کے نزدیک وہ منتخب نہیں نامزد تھے اہل سنت کے نزدیک وہ منتخب تھے اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ انہیں عالم اسلام کے تمام صوبوں کی نہیں بلکہ مسلمانوں کے ایک حصے کی حمائت حاصل تھی۔

II

دُنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور

متمدن اقوام ہی نہیں، وحشی باشندوں میں بھی حکمرانی اور عدل گستری کے لیے معینہ قاعدے ہوتے ہیں اور خودرائے سے خودرائے سردار بھی اپنے آپ کو پابند پاتا ہے (Grammar of Politics by H.J. Laski میں بھی یہی نتیجۂ استقرا نکلا ہے۔) عموماً جب کبھی ایسے قواعد تحریری صورت میں مرتب ہوئے تو انہیں کتاب کا نام دیا گیا (Scripture) اور (Bible) کے معنی بھی کتاب کے ہیں۔ چنگیز خاں کے یاسہ (سالک ابن فضل اللہ العمری، مخطوطہ پاریس۔ مقریزی وغیرہ نے بھی یاسہ کے احکام کا اقتباس محفوظ کیا ہے جسے اب روسی مؤلف دوبارہ زندہ کر رہے ہیں) کے معنی بھی کتاب کے ہیں۔ چنانچہ جدید ترکی میں بھی یازمک کا مصدر لکھنے کے معنوں میں ہی برتا جاتا ہے، اور ''کتاب اللہ'' مسلمانوں کے قرآن کا نام ہے۔

غرض عام قواعد وقوانین ملک کم وبیش تحریری صورت میں ہر جگہ ملتے ہیں۔ لیکن دستور مملکت کو عام قوانین سے علیحدہ تحریری صورت میں لانا اس کی نظیر باوجود بڑی تلاش کے مجھے عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نہیں مل سکی۔ بلاشبہ منوسمرتی (500 ق م) میں راجہ کے فرائض کا بھی ذکر ہے اور کوتلیا کی آرتھ شاستر (300 ق م) اور اسکے ہمعصر ارسطو کی کتابوں میں سیاسیات پر مستقل تالیفیں بھی ملتی ہیں۔ ارسطو نے تو اپنی ہمعصر شہری مملکتوں میں سے بشمول ہندوستان Aristotle on the Athenion Constitution by (Kenyon P.XV. نیز Encyclopaedia of Social P.XIII) Sciences) کے دستور بھی لکھے تھے جن میں سے صرف شہر ایتھنز کا دستور ابھی پچاس

سال قبل مصر میں بردی کاغذ (پاپیروس) پر محفوظ مل چکا ہے اور **1891** میں شائع ہو چکا ہے، اور انگریزی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ لیکن سب یا تو درسی اور مشاورتی کتابوں کی حیثیت رکھتی ہیں یا کسی مقام کے دستور کا تاریخی تذکرہ ہیں۔ کسی مقتدر اعلیٰ کی طرف سے نافذ کردہ مستند دستور مملکت کی حیثیت ان میں سے کسی کو حاصل نہیں۔

1 ھ میں مدینہ منورہ میں ہجرت کر آنے کے پہلے ہی سال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نوشتہ مرتب فرمایا جس میں حکمران کے حقوق اور فرائض اور دیگر فوری ضروریات کا تفصیلی ذکر ہے۔ خوش قسمتی سے یہ دستاویز پوری کی پوری اور بلفظہٖ ابن اسحاق اور ابوعبیدہ نے اپنی کتابوں میں محفوظ کی ہے، اور آج اسی کا کچھ بیان مقصود ہے۔

اس دستاویز میں ترپن (۵۳) جملے، یا قانونی الفاظ میں "دفعات" ہیں اور اُس زمانے کی قانونی عبارت اور دستاویز نویسی کا وہ ایک انمول نمونہ ہیں۔ اس کی اہمیت اسلامی مؤرخوں سے کہیں زیادہ یورپی عیسائیوں نے محسوس کی۔ دلہاوزن، میولر، گریمے، اشپرنگر، ونیسنک، کائتانی، بول وغیرہ کے علاوہ ایک انگریز مورخ نے مختصر تاریخ عالم لکھتے ہوئے بھی اس دستاویز کا تفصیلی ذکر کرنا ضروری خیال کیا ہے۔ یہاں ان جرمن، ولندیزی، اطالوی، انگریزی اور دیگر مؤلفوں کے بیانات کا ذکر غیر ضروری ہے۔ میں صرف اپنے ناچیز خیالات اس کے متعلق عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، اور اس کی اہمیت کی طرف اہل ملک کی توجہ منعطف کراتا ہوں۔ اس دستاویز کی تفصیلی شرح اور مغربی مؤلفوں کے بیانات کی تنقید کے لیے بڑا وقت چاہیے جو اس لیکچر (موتمر دائرۃ المعارف، العثمانیہ، حیدرآباد۔) میں ممکن نہیں۔

لیکن قبل اس کے کہ اس دستاویز کے مندرجات پر کچھ عرض کیا جائے اس کا تاریخی منظر اور ان حالات کا ذکر ضروری ہے جن میں وہ مرتب اور نافذ ہوئی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ معظمہ میں اپنے تبلیغی اور اصلاحی کام کا آغاز کیا، اور صدیوں، نسلوں کے معتقدات و رواجات کی تبدیلی چاہی تو اہلِ ملک نے ابتداً حیرت اور پھر نفرت اور آخر کار مخالفت و معاندت کا برتاؤ کیا۔ یہ مشن پہلے ہی دن سے عالمگیر تھے اور معلوم دنیا، خاص کر ایران و روم (بازنطین) تک اس کی فوری اور بآسانی وسعت کے

امکانات نظر آتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ میں ظاہر بین دنیاداروں کو ان ممالک کی فتح کی بشارت دیتے تھے۔ (ابن ہشام ص 278، نیز طبقات ابن سعد احوال قبل الہجرۃ۔) لیکن ایک مفلس اور کمزور قبیلے کے ایک جونیئر فرد کی حیثیت میں آپ کی سرداری کا مانا جانا مشکل تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتہ داری طائف (معارف ابن قتیبہ ص ۴۳، کتاب المنتقی من دلائل النبوۃ لابی نعیم (مخطوطہ) الفصل العشرون۔) اور مدینے (ابن ہشام ص 107، 336، 346، طبقات ابن سعد ج ۱/ص 34، 45، 46 معارف ابن قتیبہ ''احوال عمومتہ'' تاریخ طبری ج 2 ص 177 تا 179 وغیرہ۔) کے قبائل سے بھی تھی، اسی توقع میں پہلے طائف کے قریب تر علاقے کو تشریف لے گئے، مگر وہاں وطن سے بڑھ کر مشکلیں پیش آئیں۔ آخر حج کے زمانے میں کئی سال تگ و دو کرنے کے بعد چند مدینے والے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرویدہ بنے، اور مدینے آنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی ساتھیوں کو پناہ اور مدد دینے کا بھی وعدہ کیا۔

مکے کی مقامی حالت ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ عام مخالفت سے بڑھ کر جسمانی اذیت سے بہتوں کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اس لیے مسلمانانِ مکہ ہجرت کر کے مدینے جانے لگے۔ مکے والے ڈرے کہ کہیں یہ لوگ باہر جا کر انتقام کی تیاریاں نہ کریں، اس لیے خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کا محاصرہ اور شب خون کی تجویز پختہ کی گئی، مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم بخیر و عافیت مکے سے نکل کر مدینے پہنچ گئے۔ جھنجھلاہٹ میں مکے والوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی [بخاری، کتاب 64 باب 84 حدیث 3، یہ مکان بی بی خدیجہؓ سے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وراثت میں ملا تھا۔ (مبسوط سرخسی 10/52)] اور دوسرے مہاجروں [ابن ہشام ص 339 ج ص 321 تا 322، نیز بنی جحش کی جائداد پر ابوسفیان کے قبضے اور فروخت کے لیے محمد بن حبیب کی المنمق (مخطوطہ) ص 185۔] کی املاک و جائداد پر غاصبانہ تسلط جما لیا۔ مدینے کے مسلمانوں اور مکے کے مہاجروں کی مجموعی تعداد چند سے سے زیادہ نہ تھی، اگرچہ مدینے کی آبادی کا اُس وقت اندازہ چار پانچ ہزار کیا جاتا ہے جن میں آدھے کے قریب یہودی تھے۔ مکہ اس وقت ایک منظّم شہری مملکت کی صورت میں تھا، وہاں فوج، محاصل، عبادت،

تعلقاتِ خارجہ، عدل گستری وغیرہ کے کوئی پچیس سرکاری عہدے تھے، جس کا تفصیلی ذکر میں نے حال ہی میں ٹرونڈرم کے موتمر مستشرقین میں پڑھے ہوئے مقالے میں کیا (مطبوعہ رسالہ اسلامک کلچر جولائی 1938ء مضمون، گزشتہ شہری مملکت مکہ۔) ہے۔

اس کے برخلاف مدینے میں ابھی نراج کی کیفیت تھی، اور قبائلی دور دورہ تھا، عرب اوس اور خزرج کے بارہ قبائل میں بٹے ہوئے تھے تو یہودی بنوالنضیر و بنو قریظہ وغیرہ کے دس قبائل میں، ان میں باہم نسلوں سے لڑائی جھگڑے چلے آرہے تھے، اور کچھ عرب، کچھ یہودیوں کے ساتھ حلیف ہوکر باقی عربوں اور ان کے حلیف یہودیوں کے حریف بنے ہوئے تھے۔ ان مسلسل جنگوں سے اب دونوں بھی تنگ آچکے تھے (ابن ہشام ص 287، طبقات ابن سعد 1/1 ص 147، مسند ابن حنبل ج 5 ص 427، بخاری، کتاب 63 باب 1، 27، 46) اور گو وہاں کے کچھ لوگ غیر قبائل خاص کر قریش کی جنگی امداد کی تلاش میں تھے (ابن ہشام ص 285، 290۔) لیکن شہر میں امن پسند طبقات کو غلبہ ہورہا تھا اور ایک کافی بڑی جماعت اس بات کی تیاری کررہی تھی کہ عبداللہ بن ابی بن سلول کو بادشاہ بنادیں، حتی کہ بخاری (بخاری، کتاب 79، باب 20۔) وابنِ ہشام وغیرہ کے مطابق اس کے تاجِ شہریاری کی تیاری بھی کاریگروں کے سپرد ہوچکی تھی۔ بے شبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت عقبہ میں بارہ قبائل میں بارہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے نقیب مقرر کرکے مرکزیت پیدا کرنے کی کوشش فرمائی تھی، مگر اس سے قطع نظر وہاں ہر قبیلے کا الگ راج تھا، اور وہ اپنے اپنے سقیفے یا سائبان میں اپنے امور طے کیا کرتا تھا، کوئی مرکزی شہری نظام نہ تھا۔ تربیت یافتہ مبلغوں کی کوشش سے تین سال کے اندر شہر میں معتدبہ لوگ مسلمان ہوچکے تھے، مگر مذہب ابھی تک خانگی ادارہ تھا۔ (سیرت ابن ہشام ص ۲۷، تاریخ طبری طبع یورپ ص ۱۵۱۱ ومابعد، نیز قرآن مجید سورہ نمبر 63 آیت نمبر 8 کی تفسیر) اس کی سیاسی حیثیت وہاں کچھ نہ تھی، اور ایک ہی گھر میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے تھے۔ ان حالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آتے ہیں، جہاں اس وقت متعدد فوری ضرورتیں تھیں:

(1) اپنے اور مقامی باشندوں کے حقوق وفرائض کا تعین۔

(2) مہاجرین مکہ کے توطن اور بسر برد کا انتظام۔

(3) شہر کے غیر مسلم عربوں اور خاص کر یہودیوں سے سمجھوتہ۔

(4) شہر کی سیاسی تنظیم اور فوجی مدافعت کا اہتمام۔

(5) قریش مکہ سے مہاجرین کو پہنچے ہوئے جانی و مالی نقصانات کا بدلہ۔

ان ہی اغراض کے مدنظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کر کے مدینہ آنے کے چند مہینے بعد ہی (ابن سعد ج 2 / اص 19۔ کتاب الاموال لابی عبید 518) ایک دستاویز مرتب فرمائی جسے اسی دستاویز میں کتاب اور صحیفے کے نام سے یاد کیا گیا ہے، اور جسے بظاہر اشخاصِ متعلقہ سے گفت و شنید کے بعد ہی لکھا گیا ہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عام قانونِ ملک کتاب اللہ یا قرآن کی صورت میں جیسے جیسے نافذ یا نازل ہوتا، تحریری صورت میں مرتب کر دیا جاتا تھا اور منکسر المزاج احتیاط پسند پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے میں اپنے ذاتی اقوال و ہدایات کو لکھنے کی عام طور سے ممانعت فرما دی تھی۔ اس کے باوجود زیر بحث دستاویز کا لکھا جانا معنی خیز ہے جسے کتاب اور صحیفے کے اہم ناموں سے یاد کیا گیا ہے جس کے معنی دستور العمل اور فرائض نامے کے ہیں۔ اصل میں یہ شہر مدینہ کو پہلی دفعہ شہری مملکت قرار دینا اور اس کے انتظام کا دستور مرتب کرنا تھا۔

ہابس، روسو وغیرہ ''معاہدہ عمرانی'' کے نظریے کے تحت مملکت کا آغاز حاکم و محکوم کے عمرانی معاہدے سے قرار دیتے ہیں۔ اس کی ایک بیّن اور واقعی مثال ہم کو بیعتِ عقبہ میں ملتی ہے۔ جس میں مدینے والوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا سردار مانا، اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ زیر بحث دستاویز ایک معاہدے کی شکل نہیں رکھتی بلکہ ایک فرض اور ایک حکم کی صورت میں نافذ کی جاتی ہے۔ چنانچہ سب لوگ جانتے ہیں کہ کتاب کے معنی فرض اور حکم کے بھی ہیں۔ **انّ الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتابًا موقوتًا. اِنَّ کِتَابَ الابرار** (ابرار کے نامۂ اعمال کا جنت میں جانا بے معنی بات ہوگی۔ میں اس کے معنی یہ لیتا ہوں کہ ابرار کے متعلق طے شدہ حکم یہ ہے کہ وہ علیین میں رہیں گے۔) **لَفِیْ عِلِیّین. کُتِبَ عَلَیْکُمْ** وغیرہ میں لفظ ''کتاب'' اسی معنی میں برتا گیا ہے۔ جرمن لفظ **(Vorschrift)** انگریزی لفظ **(Prescription)** فرانسیسی لفظ **(Prescipend)** اور ہسپانوی **(Prescipcisn)**

(بمعنی فرض وحکم) کا مادہ بھی ''کتاب'' ہی کے معنی رکھتا ہے۔

عرب میں عام طور پر اور مدینے میں خاص طور پر جو مرکز گریزی تھی اُس کا علاج تنظیم پسند اور وحدت خواہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تجویز کیا کہ ''ایک حکمران ایک قانون'' ابھی تک زکوٰۃ اور حج کے مرکز کش احکام نہیں آئے تھے جن سے مرکزی حکومت کو ٹیکس لگانے اور وصول کرنے کا حق مل کر ملک میں بزور ایک نقطے پر لوگوں کو لانے کا اور ہر حصے کے لوگوں کو ایک ہی قبلے کی زیارت کا بعد میں موقع ملا، پھر بھی ایمان واعمال کے سلسلے میں ایک خدا کو ماننے، ایک ہی نبی صلعم کے احکام کی اطاعت کرنے اور مل کر ایک ہی سمت نماز پڑھنے کے ادارے وجود میں آچکے تھے۔ اب اس دستور نے اس میں ایک نہایت اہم اور عرب کے لیے انقلابی اصلاح وترقی یہ دی کہ لوگ اپنے حقوق اپنی یا زیادہ سے زیادہ اپنے خاندان کی مدد سے حاصل کرنے کی جگہ انصاف رسانی کو ایک مرکزی اور پبلک ادارہ بنا دیں۔ یہ عہد آفریں کارنامہ اسی دستاویز میں ریکارڈ میں لایا گیا ہے جس نے قبائلیت کی افراتفری کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا اور ایک وسیع تر ادارے یعنی مملکت کی بنیاد ڈالی۔ اس دستاویز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عدالتی، تشریعی، فوجی اور تنفیذی اعلیٰ ترین اختیارات اپنے لیے محفوظ فرما لیے مگر ایک نہایت اہم اور قابلِ ذکر فرق اس اقتدار اور دیگر ممالک کے مستبدانہ شاہی اقتدار میں یہ تھا کہ یہاں مادیت کو دخل نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاست میں اخلاقی عناصر داخل کیے، اصل سرچشمہ اقتدار خدا کو قرار دیا اور اپنے کو اس کا رسول اور نائب اور ساتھ ہی اُمت کے لیے لائے ہوئے احکام اپنے اوپر بھی مساوی طور پر واجب التعمیل قرار دیے۔ اور عہد نبوی میں ذات اقدس کے خلاف دیوانی اور ٹارٹ (ضمان) کے جو مقدمات دائر (ابن ہشام ص ۴۴۴، نیز تاریخ ابن الاثیر ذکر احوال مرض موت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وسیرۃ شامی، برموقع۔ جہاں چھ آٹھ مقدموں کا ذکر ہے۔) ہوئے ان نظائر کی موجودگی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نے **(King can do no wrong)** (بادشاہ کسی فعل ناجائز کا مرتکب ہو ہی نہیں سکتا) کو مسترد کر دیا۔ اور جب ملک کا قوی ترین شخص قانون کی خلاف ورزی پر عدالتی دار و گیر سے محفوظ نہ رہ سکے تو دیگر عہدہ دار اور عام لوگ بھی تعمیل زیادہ توجہ کے ساتھ کریں گے۔ اس دستاویز کے دو نمایاں

حصے ہیں:

حصہ اوّل میں (25) فقرے ہیں جن کو ولماوزن نے (23) قرار دیا تھا اور جملہ یورپی مؤلفوں نے ولماوزن ہی کے نمبرات برقرار رکھے ہیں، میں نے بھی مجبوراً (23) ہی نمبر دیے، البتہ ضمن الف و ب کر کے دو دفعات کو دو حصوں میں بانٹ دیا اور اس طرح ان کے (25) دفعات قرار دیے تاکہ یورپی مواد سے استفادے میں کسی کو الجھن پیدا نہ ہو۔

حصہ دوم 24 تا 47 فقروں پر مشتمل ہے لیکن ضمنی تقسیم متعدد فقرات میں کرنی پڑی۔ میرے حساب سے یہ حصہ (28) فقرات پر مشتمل ہے اور جملہ دستاویز میں (53) فقرات یا دفعات ہیں۔

پہلے (23) دفعات مہاجرین و انصار کے متعلق قواعد پر مشتمل ہیں اور بقیہ حصہ مدینے کے یہودی قبائل کے حقوق و فرائض سے بحث کرتا ہے۔ ان دونوں میں ایک جملہ دہرایا گیا ہے کہ آخری عدالت مرافعہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہو گی۔ مسلمان مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم کی حد تک تو کوئی دشواری نہیں لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہجرت کے چند مہینوں بعد ہی ایک نو وارد اجنبی کو اتنا بڑا اقتدار غیر مسلم طبقات نے دے دینا کس طرح منظور کیا؟ مدنی عربوں کی حد تک یہ جواب ایک حد تک تشفی بخش سمجھا جا سکتا ہے کہ چونکہ وہاں اب تک قبائلی نظام تھا اور قبائلی سرداروں نے اسلام قبول کر لیا تھا اس لیے بزرگانِ خاندان کا مذہب قبول نہ کرتے ہوئے بھی اُن کے خوردتر رشتہ دار اُنہی کی سی کرنے پر مجبور تھے۔ عربی سماج کے باعث وہ خاندان اور قبیلے سے الگ نہ ہو سکتے تھے اور بیرون ملک بھی وہ اپنے باقی رشتہ داروں کی مدد کے بغیر جان و مال کا کوئی امن نہیں پا سکتے تھے۔ دستاویز میں صراحت سے یہ بتایا گیا ہے کہ جملہ مدنی قبائل اور مہاجرین مکہ وغیرہ کی مرکزائی ہوئی زبردست قوت سے انصار کے مشرک رشتہ داروں کو متمتع ہونے کا صرف اس شرط سے موقع دیا جاتا ہے کہ وہ سیاسی حیثیت سے مرکزی حکومت کی پالیسی میں رکاوٹیں نہ ڈالیں۔ چنانچہ حکم دیا گیا ہے کہ عربی قبائل جو مشرک یا یہودی المذہب لوگ ہیں وہ مسلمانوں کے تابع اور جنگ میں معاون ہوں اور وہ قریشِ مکہ کی جان و مال کو نہ تو خود کوئی امان دیں اور نہ اس بات میں آڑے آئیں کہ مسلمان کسی قریشی کی جان و مال پر حملہ کریں۔ دوسرے الفاظ

میں ان کو قریشیوں سے حلیفی توڑنے، تعلقات منقطع کرنے اور مسلمان اور قریشیوں کے تعلقات میں غیر جانبدار رہنے کی شرط پر حقوق شہریت عطا کیے گئے اور انہیں اس کو منظور کرنا پڑا۔ ہمیں ایسے بھی بیانات عرب مؤلفوں کے ہاں ملتے ہیں کہ مدینے کے عرب برادر کشی اور باہمی لڑائیوں سے اُکتا گئے تھے اور تنگ آ کر اس پر آمادہ ہو چکے تھے کہ کسی اجنبی غیر جانبدار کو حکمران بنا کر آئندہ امن کی زندگی بسر کریں یہ عربی غیر مسلموں کا ذکر تھا۔

یہودیوں کا بھی اسی ابتدائی زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی اقتدار کو مان لینا قرین قیاس نہیں۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دستور کا حصہ دوم، یعنی یہودیوں کا دستور العمل، جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہے جبکہ ایک زبردست فتح سے مسلمانوں کی دھاک ہر طرف بیٹھ گئی تھی اہل مدینہ نے اپنے سابقہ معاہدات حلیفی جو یہودیوں کے ساتھ تھے منسوخ کر لیے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آس پاس ینبوع تک کے قبائل مثلاً بنی ضمرہ، جہینہ وغیرہ سے حلیفیاں کر کے مسلمانوں کی قوت کو بے حد مضبوط اور مستحکم بنا دیا تھا۔

یہودیوں کے دو بڑے گروہ آپس کے حریف و رقیب تھے۔ ان کا ملکر رہنا اور الگ مستقل رہ کر نچنت اور محفوظ رہنا ممکن نہ تھا، اور وہ ہر طرف سے بچھڑ کر بے یارو مددگار اور ہر قوی کا شکار بنے ہوئے تھے۔ ان حالات نے انہیں مجبور کیا کہ اپنی مذہبی آزادی اور اندرونی خود مختاری برقرار رکھتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ماتحتانہ تعاون کریں اور جیسا کہ عرض کیا گیا میرے خیال میں یہ جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہو سکتا ہے، اس سے پہلے کا ہونا قرین قیاس نہیں۔ اگرچہ پوری دستاویز ایک ہی کُل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی عبارت و انداز اسلوب سے بھی ایک ہی مرتب کنندہ کا ہونا پایا جاتا ہے اور مسلمان مورخ عام طور سے یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ دستاویز 1ھ کی ابتدا میں مرتب ہوئی لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ 1ھ میں دستاویز کا حصہ اوّل مرتب ہوا ہو، اور بقیہ حصہ 2ھ میں جنگ بدر کے بعد مرتب کر کے حصہ اول کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہو اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ لسان العرب (تحت کلمہ ''ربع'') میں اس دستاویز کا جہاں کہیں ذکر آیا ہے وہاں اس کو دو نام دیے گئے ہیں۔ ایک جملے میں اُسے **''فی کتابہ للمهاجرین والانصار''** کہہ کر اسے ''دستور العمل مہاجرین وانصار'' سے یاد کیا گیا ہے اور اسی سے ذرا نیچے حصہ دوم کے سلسلے

میں "ووقع فی کتاب رسول اللہ صلعم لیھود" "دستورالعمل یہودیان" کی اصطلاح برتی گئی ہے۔ ایک اور راست شہادت اس سے ملتی ہے کہ امام ابو داؤد نے اپنی سنن (سنن ابی داؤد کتاب نمبر 19، باب نمبر 21) میں یہودیوں کے اس دستورالعمل کو جنگِ بدر کے بعد کا قرار دیا ہے۔

جیسا کہ عرض ہوا، اس دستور کے دو نمایاں اور ممتاز حصے ہیں، ایک اسلامی وعربی قبائل سے متعلق ہے اور دوسرا یہودیوں سے۔ ہر ایک کی مختصر تحلیل یہاں بے محل نہ ہوگی۔

سب سے پہلے فقرے میں ایک اسلامی سیاسی وحدت کے قیام کا اعلان کیا گیا ہے جس میں مہاجرین مکہ، انصار مدینہ اور وہ لوگ جو ان سب کے تابع ولاحق رہ کر اس کے ہمراہ جنگ میں حصہ لینے پر آمادہ ہوں اور یہ سیاسی وحدت "محمد یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے احکام کی اطاعت کرے گی۔

ف1 اور اس اسلامی حصے کے سب سے آخری فقرے میں بھی مکرر اسی چیز کو دہرایا گیا ہے کہ منبع اقتدار تو ذاتِ خداوندی ہے لیکن لوگ خدا کے بھیجے ہوئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں گے اور اپنے جملہ اختلافوں و جھگڑوں میں ان سے ہی رجوع ہوں گے اور اُن کے فیصلے کو آخری مانیں گے۔

(23) یہ سیاسی وحدت باوجود اندرونی بوقلمونی کے اُمت واحدہ سمجھی جائے گی اور تمام دُنیا کے مقابل ایک ممتاز اور مستقل حیثیت رکھے گی۔ اور جملہ مسلم طبقات کو یکساں حقوق و واجبات حاصل ہوں گے۔

ف2 باوجود کمی تعداد و کمزوری وخطرات کے، ان میں خودداری اور راہِ راست پر ہونے کے جذبات پیدا کیے گئے۔ (13،2) جنگ و صلح کو مرکزی مسئلہ قرار دیا گیا، اور یہ نہیں ہو سکے گا کہ چند صلح یا جنگ کریں اور باقی نہ کریں۔ جنگی خدمت جبری ولازمی ہوگی۔ اور سب اُس میں برابر کا حصہ لیں گے۔ عین حالتِ جنگ میں بھی نوبت بہ نوبت فوجیں لڑیں گی اور آرام پائیں گی، یہ نہیں کہ پورا بار ایک ہی طبقے پر پڑے۔ (18،17) جنگ و صلح تو مرکزی مسئلہ ہوں گے۔ البتہ حسب سابق پناہ دہی کا حق انفرادی طور سے ہر چھوٹے بڑے سب کو حاصل ہوگا اور ادنیٰ ترین شخص کے دیے ہوئے

وعدۂ پناہ کا بھی پوری اُمت احترام کرے گی۔ (15) اور اس طرح اخوت و مساوات اور آزادئ عمل اس سیاسی وحدت میں عملی طور سے جاری و ساری کر دی گئی۔ پناہ دہی کی اس آزادی میں ایک شرط لگائی گئی کہ جو مشرکین عرب اس سیاسی وحدت میں حقوقِ رعیت حاصل کرنا چاہیں ان کے لیے یہ پابندی ہوگی کہ وہ قریش کی جان و مال کو کسی طرح کی پناہ نہ دیں گے اور نہ اس بات میں آڑے آئیں گے کہ قریش کی جان و مال کو مسلمان اپنے حقوقِ حربیت کے سلسلے میں نقصان پہنچائیں۔

(20ب) اس دفعہ کے سلسلے میں دو واقعات قابل ذکر ہیں۔ جن کا امام بخاری (بخاری کتاب 4، باب نمبر 2 نیز کتاب نمبر 64 باب 2) نے ذکر کیا اور جو دونوں جنگِ بدر سے پہلے پیش آئے تھے۔ ان دونوں میں دو بڑی مسلمان شخصیتوں نے بعض قریشی افراد سے دوستانہ تعلقات کی بناء پر اُن کی جائیداد کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ بے شبہ اس دفعہ میں قریش کو پناہ دینے کی ممانعت صرف مشرک رعایا کو دی گئی ہے لیکن قیاس یہ چاہتا ہے کہ مسلمان بھی اس کے پابند تھے اور بلا صراحت وہ اس پر عمل کرتے تھے۔ اسی بنا پر میرا خیال ہے کہ یہ دفعہ ابتدائی دستور میں نہ تھی۔ بعد میں جنگ بدر کے اختتام پر یہودی قبائل سے معاہدے کے بعد یا کسی قریبی موقع پر اس اصل دستور میں اضافہ کی گئی۔ جنگ کے سلسلے میں جملہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کا مددگار اور دُکھ درد میں حصہ دار رہنے کا حکم دیا گیا۔

(19) عدل گستری کے سلسلے میں آخری عدالتِ مرافعہ جہاں ذاتِ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو قرار دیا گیا۔ وہیں ہرجے اور خون بہا (ضمان و دیت) کی ادائی کے لیے قدیم نظام بیمہ کی توثیق و تشریح کی گئی کہ اگر کوئی شخص کسی رقمی ادائی کا مستوجب ہو تو اس کی مدد اس کے سب رشتہ دار کریں گے۔ اس طرح اگر کوئی شخص دشمن کے ہاتھوں قید ہو جائے اور فدیہ ادا کرنا ہو تو اس کے اہل قبیلہ ہی اس ادائی کے ذمہ دار ہوں گے۔

(4) اس سلسلے میں ایک طرح سے شہر کی محلہ وار تقسیم کی گئی اور ہر قبیلے کے لوگ دوسروں سے الگ یکجا ہی رہتے تھے، اور ہر محلے میں ایک میر محلہ اور متعدد نائبان میر محلہ اور

اجتماع گاہ پائے جاتے تھے جن کو علی الترتیب نقیب، عریف اور سقیفہ کہتے تھے۔ کوئی محلہ وار فنڈ یا خزانے کا پتہ تو نہیں چلتا (لیکن بنوالنضیر کے یہودیوں میں قبیلہ داری بیت المال تھا چنانچہ سیرۃ شامی میں غزوہ سویق کے بیان میں لکھا ہے "سلام بن مشکم و کان سید بنی النضیر زمانہ ذلک و صاحب کنزھم ...... یعنی بالکنزھنا المال الذی کانوا یحمعونہ لتوابیھم وما بعرض لھم، یعنی سلام بن مشکم اس زمانے میں بنوالنضیر کا سردار اوران کا افسر خزانہ تھا......خزانے سے مراد یہاں مال ہے جو وہ اتفاقی حوادث اور ضروریات کے لیے جمع کیا کرتے تھے) غالباً حسب ضرورت چندہ ہوتا ہوگا یہ محلّہ وار مجالیس بڑی حد تک خود مختار اور خود اکتفا تھیں۔

انصار کے قبائل تو معین تھے ہی اب ان عدالتی و سماجی اغراض کے لیئے جملہ مہاجرین کا بھی ایک قبیلہ قرار دیا گیا۔

(3) اور یہ قرار دیا گیا کہ اگر کوئی محلّہ دار مجلس اپنے کسی اہل محلّہ کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے قابل نہ ہو تو دیگر مجالس بھی ہاتھ بٹانے کی پابند ہوں گی۔ (۱۲) اور یہ بھی صراحت سے بتایا گیا کہ اگر کسی قبیلے میں کوئی موالی ہو یعنی کسی فرد سے قانونی اور معاہداتی بھائی چارہ کر کے اس قبیلے کے رکن بنے ہوں تو ایسے موالی کو اپنے اصل سے اختلاف کا حق نہ ہوگا۔

(12ب) اس نظام ولاء کے سلسلے میں یہ بھی حکم دیا گیا کہ ایک شخص کے مولا کو کوئی دوسرا شخص بلا اجازت اصل اپنا مولا نہ بنائے، (بروایت ابن حنبل) انصاف رسانی کا اختیار افراد سے لے کر جماعت یعنی مرکز کے سپرد کر دیا گیا جو ایک عظیم الشان انقلاب تھا اور حکم دیا گیا کہ انصافی مسائل میں جانبداری کرنے اور اپنے رشتہ داروں کی مدد کرنے بلکہ خود حقیقی بیٹے تک کو بچانے کی کوشش کرنے کی کسی کو اجازت نہ ہوگی۔ اور جملہ مسلمان اس بات کی کوشش کریں گے کہ ہر ضرر پہنچانے یا ضرر پہنچانے کی تیاری کرنے والے شخص کو کیفر کردار تک پہنچانے میں پوری طرح ہاتھ بٹائیں۔

(13) قتل عمد کی سزا قصاص مقرر کی گئی البتہ مقتول کے ولی کو اختیار دیا گیا ہے کہ دیت لے کر قصاص سے درگزر کرے اور انصاف رسانی میں مداخلت کی سختی سے ممانعت کی گئی۔

(21) اسلام کی حقانیت جتانے اور اس کا بول بالا کرنے کے لیے مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا کہ اگر ان کا کوئی غیر مسلم رشتہ دار کسی مسلمان کے ہاتھوں مارا جائے تو قصاص پر اصرار نہ کریں اور کسی مسلمان کے خلاف کسی غیر مسلم کی مدد نہ کریں۔

(14) اسی طرح کسی قاتل مجرم کو پناہ یا مدد دینے کی ممانعت کی گئی اور کہا گیا کہ جو خدا اور قیامت پر ایمان لایا ہے اور جس نے اس دستاویز کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا ہے، اگر کسی قاتل کو مدد یا پناہ دے تو قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہوں گے اور اس کی رستگاری کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

انصار کے بعض لوگ یہودیت قبول کر چکے تھے، خاص کر بعض بچوں کو اُن کے والدین منت مان کر یہودی بنا دیتے تھے۔ اُن کے متعلق بھی ایک خصوصی دفعہ رکھ دی گئی کہ اگر وہ ماتحتانہ اتحادِ عمل پر آمادہ ہوں تو انہیں سب مسلمانوں کے برابر حقوقِ رعیت حاصل ہوں گے۔ ان کی حفاظت و مدد کی جائے گی ....اور ان پر کوئی ظلم روا نہیں رکھا جائے گا۔ (16)

یہاں تک ان امور کا ذکر ہوا جو حصہ اوّل میں درج ہیں اور جو مدینے کے عربوں سے متعلق ہیں۔ حصہ دوم یہودیوں کے قبائل سے متعلق ہے۔

اس امر سے بحث ہو چکی ہے کہ آیا یہودیوں کا یہ دستور انصار و مہاجرین کے قواعد کے ساتھ ہی بنایا گیا یا بعد۔ اس حصے کی مختصر تحلیل کے سلسلے میں عرض ہے کہ اس کی پہلی دفعہ مشترک ہے کہ کسی جنگ کی صورت میں اگر مسلمان اور یہودی اتحادِ عمل کریں تو ہر حلیف اپنے مصارف جنگ خود برداشت کرے گا اور یہ حکم صرف (24) میں بیان ہوا ہے بلکہ (37 الف اور 38) میں بھی دہرایا گیا ہے اور غالباً (45 ب) کی مبہم عبارت کا بھی یہی منشا ہے کہ (**علیٰ کل اناس حصتھم من جانبھم الذی قبلھم**) جس کو ابو عبید نے "**حصتھم والنفقھة**" لکھا ہے۔ اس تکرار کی وجہ غالباً یہی تھی کہ مالی معاملات میں

یہودی بہت بدنام تھے۔ ان کی بدمعاملگی کو "لیس علینا فی الامین سبیل" اور منھم مَن ان تامَنہ، بدینارٍ لایؤدّہ الیک" وغیرہ آیات قرآنی میں بھی طشت از بام کیا گیا ہے۔

جب مصارف برداشت کرنے کی ذمہ داری تھی تو ظاہر ہے کہ انہیں مالِ غنیمت کو پانے کا بھی حق حاصل تھا جیسا کہ ابوعبیدہ نے اپنی شرح میں صراحت بھی کی ہے۔ (روض الانف "السہیلی ج 2 ص 17۔ کتاب الاموال لابی عبید 517) یہودیوں نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی اقتدار کو مان لیا تھا اور ہر اختلاف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو آخری تسلیم کر لیا تھا، جیسا کہ (42) میں نہایت صراحت سے قرار دیا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ (25) میں "یہودی اپنے مذہب پر اور مسلمان اپنے مذہب پر" کہہ کر دینی آزادی اور رواداری کا اعلان کرنے کے باوجود (42) میں ابن اسحاق کی روایت میں "محمد رسول اللہ صلعم" اور ابوعبید کی روایت میں "محمدؐ النبی" کے الفاظ برتے گئے ہیں اور (47) میں ابن اسحاق کے ہاں "محمدؐ رسول اللہ" کا کلمہ مکرر آیا ہے تو ابوعبید کی روایت میں یہ جملہ حذف کر دیا گیا ہے۔ اس کے معنی غالباً یہ تو نہیں ہوں گے کہ ان یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت یا نبوت مان لی بلکہ ان تاریخی کتابوں کے کسی باادب کاتب نے یہ لفظ بڑھائے ہوں گے (کیونکہ ابن اسحاق کے ہاں دونوں جگہ آخر میں صلی اللہ علیہ وسلم بھی لکھا ہے جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے متعلق لکھنا قرین قیاس نہیں ہے) یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ "نبی" یا "رسول اللہ" کا لفظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود لکھا تھا اور یہودیوں نے اپنی خطرناک سیاسی و جنگی حالت کے مدنظر اس پر اعتراض کی جرأت نہ کی۔ "صلی اللہ علیہ وسلم" کے استعمال کے متعلق سیرۃ "ابن ہشام ص 992 سطر 3 سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خطبے وغیرہ میں آنحضرت اس کا بطور دعا خود بھی اپنے متعلق استعمال فرمایا کرتے تھے۔

اس ذیلی بحث کے قطع نظر اس دستاویز میں دس یہودی قبائل کا فرداً فرداً نام بنام ذکر کیا گیا اور ان کے حقوق کی مساوات تسلیم کی گئی۔ اس کا منشا بظاہر یہ ہے کہ یہودیوں نے ایک جماعت بن کر اس وفاقی شہری مملکت مدینہ میں شرکت نہیں کی بلکہ ہر قبیلہ ایک علیحدہ

وحدت کی حیثیت سے داخل ہوا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اگر مسلمانوں نے چند یہودی قبائل سے جنگ کی یا نہیں، مدینے کی سرزمین سے نکل جانے کا حکم دیا تو نہ صرف باقی قبائل خاموش رہے بلکہ بعض مواقع پر انہوں نے مسلمانوں کی جنگی مدد بھی کی اور اس جنگ کے باوجود یہ معاہدہ یا دستور دیگر یہودی قبائل کی حد تک باقی رہا، منسوخ نہیں سمجھا گیا۔ چنانچہ اس دستور میں خون بہا کی ادائی میں اہلِ قبیلہ اور موالی مشترکہ طور پر ذمہ دار قرار دیے گئے تھے اور بنی قینقاع کے اخراج کے بعد بنوالنضیر سے اسی قرارداد (25، 31) کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر چندہ دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ (ابن ہشام ص 652۔ ابن سعد ج ۲/۱ ص 40 تا 41۔ تاریخ طبری طبع یورپ ص 1449 تا 50) یہودیوں کو مسلمان رعایا کے ساتھ سیاسی وتمدنی حقوق میں صراحت سے مساوات دی گئی (25) اور یہودیوں کے معاہداتی رشتہ داروں کو جنہیں موالی بطن، اور بطانہ کا نام دیا گیا ہے، حقوق اور ذمہ داریوں میں عام اور اصلی یہود کے برابر مان لیا گیا ہے۔ (32، 40، 34، 45، 46) ۔ البتہ پناہ گزیں بلا اجازت پناہ دہندہ کسی اور کو پناہ نہیں دے سکتا۔ (41)۔

یہودیوں سے اصل میں ایک جنگی حلیفی کی گئی تھی چنانچہ (37، 41 اور 45) میں صراحت سے قرار دیا گیا ہے کہ وہ ان سب سے لڑیں گے جن سے مسلمان لڑیں اور ان سب سے صلح کریں گے جن سے مسلمان صلح کریں اور مدینے کی مدافعت میں مشترکہ حصہ لیں گے اور مسلمانوں پر کوئی حملہ آور ہو تو یہودی مسلمانوں کو مدد دیں گے اور یہود پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمان، یہودیوں کو مدد دیں گے، البتہ دینی جنگوں میں جو مسلمان اختیار کریں یہودیوں کو ہاتھ بٹانے کی ذمہ داری نہ ہوگی (45) نیز مسلمان کے ساتھ فوج میں ان کی شرکت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت پر منحصر رکھی گئی (36 الف)۔ اس دفعہ کی عبارت کسی قدر مبہم ہے اور یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر خود بھی مستقلاً کسی سے جنگ نہیں کر سکتے۔ اگر یہ واقعہ ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی اقتدار کی مزید وسعت ظاہر ہوتی ہے۔ اس اہم قرارداد سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مکے کے قریش متاثر ہوئے ہوں گے جو مسلمانوں کے مخالفہ مدد دے سکنے والے ایک اہم حلیف یعنی یہودیوں کی اعانت سے محروم کر دیے گئے

جیسا کہ (43) میں قرار دیا گیا ہے کہ یہودی، قریش اور قریش کے مددگاروں کو کوئی پناہ نہیں دیں گے، گو بدقسمتی سے عمل اس پر نہ ہوا اور یہودی سردار برابر قریش سے سازش کرتے رہے اور جنگِ بدر کی شکست کے بعد اس کا سلسلہ جو شروع ہوا تو بنو قریظہ کی بلا شرط اطاعت تک برابر جاری رہا۔ (البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج 4، ص 6۔ ابن ہشام ص 681 نیز: پروفیسر ٹارے کی ''جوش فاؤنڈیشن آف اسلام'') بہر حال صلح و جنگ کو وفاق کا بلا شرط ایک مرکزی مسئلہ قرار دے دیا گیا، اور جنگ کی کمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہو گئی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبردست سیاسی کامیابی تھی۔

سماجی اور اندرونی مسائل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی مداخلت نہیں کی اور فدیہ، دیت اور جوار یا پناہ دہی اور معاہداتی رکنیت قبیلہ کے ادارات اور رواجات کو برقرار رکھا گیا (25، 31، 40)۔ اس فرزانہ سیاست کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی کو ہچکچاہٹ اور گھبراہٹ نہیں ہوئی اور یہودیوں نے خوشی سے اس کو منظور کر لیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی بھی آخری عدالت مرافعہ کے فرائض انجام دیں (42)۔ نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے مقدمات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے شخصی قانون ہی کے مطابق فیصلے فرمایا کرتے تھے۔ جنگ و صلح کی طرح یہودیوں کی عدل گستری کو بھی (36 ب میں) صراحت کے ساتھ مرکزی مسئلہ قرار دیا گیا۔ اور انصاف میں رشتہ داری وغیرہ کے باعث دخل دہی کی قطعی ممانعت کی گئی اور قدیم زمانے کے انتقامات اور انتقام کے انتقامات کا لامتناہی سلسلہ یک لخت روک دیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہودیوں پر عدالتی اقتدار اعلیٰ بھی مسلمانوں کے لیے بڑی سیاسی فتح تھی۔ یہودیوں نے نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا مقتدر اعلیٰ تسلیم کر لیا بلکہ شہر مدینہ و مضافات (جوف) کو ایک حرم بھی تسلیم کیا (39)۔ مکہ ایک حرم تھا۔ شہر طائف کی حرمت کو 9 ھ کے معاہدۂ طائف میں بھی تسلیم اور برقرار رکھا گیا (دیکھئے کتاب الاموال لابی عبید ص 506) یہودیوں سے ایک نیم عرب شہر کو حرم مقدس منوالینا بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک سیاسی کارنامہ تھا اور اس طرح ایک چھوٹی سی بستی کو جو بیس ایک محلوں پر مشتمل تھی شہری مملکت کی صورت میں منظم کیا گیا، اور اس کی قلیل لیکن بوقلموں و کثیر الاجناس آبادی کو ایک لچکدار اور قابل عمل دستور کے تحت ایک

مرکز پر متحد کیا گیا اور ان کے تعاون سے شہر مدینہ میں ایک ایسا سیاسی نظام قائم کر کے چلایا گیا کہ وہ بعد میں ایشیاء یوروپ اور افریقہ کے تین براعظموں پر پھیلی ہوئی ایک وسیع اور زبردست شہنشاہت، کا بلا کسی وقت کے صدر مقام بھی بن گیا۔ یورپ کے لفظ پر آپ حیران نہ ہوں، عہد بنی اُمیہ سے بہت پہلے حضرت عثمانؓ کے زمانے میں **27** ھ میں مسلمانوں کی فوجیں اندلس میں داخل ہو گئیں اور مزید کمک نہ ملنے کے باوجود وہیں مقیم اور ملک کے ایک حصے پر قابض رہیں تا آں کہ بہت دنوں کے بعد طارق آتا ہے اور اندلس کی فتح کو مکمل کرتا ہے، عہد عثمانی کی اس مہم کا ذکر طبری (تاریخ طبری ص 17/280) اور گبن (Decline and Fall of the Roman Empire V-P 555) نے بھی کیا ہے، اور سب جانتے ہیں کہ عہد عثمانی تک مدینہ ہی مرکزِ خلافت تھا۔

اس دستاویز میں ایک جگہ لفظ ''دین'' بھی برتا گیا ہے۔ اس لفظ میں بیک وقت مذہب اور حکومت دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے اور یہ ایک ایسا اہم امر ہے کہ اس کو پیش نظر رکھے بغیر مذہب اسلام اور سیاسیات اسلام کو اچھی طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔

III

پہلے تحریری دستور کی دفعات

رحم والے اور مہربان خدا کے نام سے۔

(1) یہ ایک حکمنامہ ہے نبی اور اللہ کے رسول محمدؐ کا قریش اور اہل یثرب میں سے ایمان اور اسلام لانے والوں اور ان لوگوں کے مابین جو ان کے تابع ہوں اور ان کے ساتھ شامل ہو جائیں اور ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لیں۔

(2) تمام (دنیا کے) لوگوں کے بالمقابل ان کی ایک علیحدہ سیاسی وحدت (اُمت) ہوگی۔

(3) قریش سے ہجرت کر کے آنے والے اپنے محلے کے (ذمہ دار) ہوں گے اور اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیں گے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(4) اور بنی عوف اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(5) اور بنی الحارث بن خزرج اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(6) اور بنی ساعدہ اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا

تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(7) اور بنی جُشم اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(8) اور بنی النجار اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(9) اور بنی عمرو بن عوف اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(10) اور بنی النبیت اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(11) اور بنی الاوس اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(12-الف) اور ایمان والے کسی قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے کو مدد دیے بغیر چھوڑ نہ دیں گے تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(12-ب) اور یہ کہ کوئی مؤمن کسی دوسرے مؤمن کے مولا (معاہداتی بھائی) سے خود معاہدۂ برداری نہیں پیدا کرے گا۔

(13) اور متقی ایمان والوں کے ہاتھ ہر اس شخص کے خلاف اُٹھیں گے جو ان میں سرکشی کرے یا استحصال بالجبر کرنا چاہے یا گناہ یا تعدی کا ارتکاب کرے یا ایمان والوں میں فساد پھیلانا چاہے اور ان کے ہاتھ سب مل کر ایسے شخص کے خلاف اُٹھیں گے خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

(14) اور کوئی ایمان والا کسی ایمان والے کو کسی کافر کے بدلے قتل نہ کرے گا اور نہ کسی کافر کی ایمان والے کے خلاف مدد کرے گا۔

(15) اور خدا کا ذمہ ایک ہی ہے۔ ان (مسلمانوں میں) کا ادنیٰ ترین فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب پر پابندی عائد کر سکے گا اور ایمان والے باہم بھائی ہیں (ساری دنیا کے) لوگوں کے مقابل۔

(16) اور یہ کہ یہودیوں میں سے جو ہماری اتباع کرے گا تو اسے مدد اور مساوات حاصل ہوگی۔ نہ ان پر ظلم کیا جائے گا اور نہ ان کے خلاف کسی کو مدد دی جائے گی۔

(17) اور ایمان والوں کی صلح ایک ہی ہوگی۔ اللہ کی راہ میں لڑائی ہو تو کوئی ایمان والا کسی دوسرے ایمان والے کو چھوڑ کر (دشمن سے) صلح نہیں کرے گا جب تک کہ (یہ صلح) ان سب کے لیے برابر اور یکساں نہ ہو۔

(18) اور ان تمام ٹکڑیوں کو جو ہمارے ہمراہ جنگ کریں باہم نوبت بہ نوبت چھٹی دلائی جائے گی۔

(19) اور ایمان والے باہم اس چیز کا انتقام لیں گے جو خدائی راہ میں ان کے خون کو پہنچے۔

(20-الف) اور بے شبہ متقی ایمان والے سب سے اچھے اور سب سے سیدھے راستے پر ہیں۔

(20-ب) اور یہ کہ کوئی مشرک (غیر مسلم رعیت) قریش کی جان اور مال کو کوئی پناہ نہ دے گا اور نہ اس سلسلے میں کسی مؤمن کے آڑے آئے گا۔

(21) اور جو شخص کسی مؤمن کو عمداً قتل کرے اور ثبوت پیش ہو تو اس سے قصاص لیا جائے گا بجز اس کے کہ مقتول کا ولی خون بہا پر راضی ہو جائے۔ اور تمام ایمان والے اس کی تعمیل کے لیے اُٹھیں گے اور اس کے سوائے انہیں کوئی اور چیز جائز نہ ہوگی۔

(22) اور کسی ایسے ایمان والے کے لیے جو اس دستور العمل (صحیفہ) کے مندرجات (کی تعمیل) کا اقرار کر چکا ہو اور خدا اور یوم آخرت پر ایمان لا چکا ہو، یہ بات جائز

نہ ہوگی کہ کسی قاتل کو مدد یا پناہ دے۔ اور جو اسے مدد یا پناہ دے گا تو قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہوں گے اور اس سے کوئی رقم یا معاوضہ قبول نہ ہوگا۔

(23) اور یہ کہ جب کبھی تم میں کسی چیز کے متعلق اختلاف ہو تو اسے خدا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کیا جائے گا۔

(24) اور یہودی اس وقت تک مؤمنین کے ساتھ اخراجات برداشت کرتے رہیں گے جب تک وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

(25) اور بنی عوف کے یہودی، مؤمنین کے ساتھ، ایک سیاسی وحدت (یا اُمت) تسلیم کیے جاتے ہیں یہودیوں کو اُن کا دین اور مسلمانوں کو اُن کا دین۔ موالی ہوں کہ اصل۔ ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو اس کی ذات یا گھرانے کے سوائے کوئی مصیبت میں نہیں پڑے گا۔

(26) اور بنی النجار کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

(27) اور بنی الحارث کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

(28) اور بنی ساعدہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

(29) اور بنی جُشَم کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

(30) اور بنی الاوس کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

(31) اور بنی ثعلبہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔ ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو خود (اس کی ذات) یا گھرانے کے سوائے کوئی مصیبت میں نہیں پڑے گا۔

(32) اور جفنہ جو (قبیلہ) ثعلبہ کی ایک شاخ ہے، اُسے بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

(33) اور بنی الشطیبہ کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔ اور وفا شعاری ہو نہ کہ عہد شکنی۔

(34) اور ثعلبہ کے موالی کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

(35) اور یہودیوں (کے قبائل) کی ذیلی شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

(36-الف) اور یہ کہ ان میں سے کوئی بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر (فوجی کارروائی کے لیے) نہیں نکلے گا۔

(36-ب) اور کسی مار، زخم کا بدلہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی اور جو خونریزی کرے تو اس کی ذات اور اس کا گھرانہ ذمہ دار ہوگا ورنہ ظلم ہوگا۔ اور خدا اس کے ساتھ ہے جو اس (دستور العمل) کی زیادہ سے زیادہ وفا شعارانہ تعمیل کرے۔

(37-الف) اور یہودیوں پر ان کے خرچے کا بار ہوگا اور مسلمانوں پر ان کے خرچے کا۔

(37-ب) اور جو کوئی اس دستور والوں سے جنگ کرے تو ان (یہودیوں اور مسلمانوں) میں باہم امداد عمل میں آئے گی۔ اور ان میں باہم حسن مشورہ اور وفا شعاری ہوگی نہ کہ عہد شکنی۔

(38) اور یہودی اس وقت تک مؤمنین کے ساتھ اخراجات برداشت کرتے رہیں گے جب تک کہ وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

(39) اور یثرب کا جوف (یعنی میدان جو پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے) اس دستور والوں کے لیے ایک حرم (اور مقدس مقام) ہوگا۔

(40) پناہ گزیں سے وہی برتاؤ ہوگا جو اصل (پناہ دہندہ) کے ساتھ۔ نہ اس کو ضرر پہنچایا جائے اور نہ خود وہ عہد شکنی کرے گا۔

(41) اور کسی پناہ گاہ میں وہاں والوں کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہیں دی جائے گی

(یعنی پناہ دینے کا حق پناہ گزیں کو نہیں)۔

(42) اور یہ کہ اس دستور والوں میں جو کوئی قتل یا جھگڑا رونما ہو جس سے فساد کا ڈر ہو تو اسے خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے (جن پر خدا کی توجہ اور سلامتی ہو) رجوع کیا جائے گا اور خدا اس شخص کے ساتھ ہے جو اس دستور کے مندرجات کی زیادہ سے زیادہ احتیاط اور زیادہ سے زیادہ وفا شعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

(43) اور قریش کو کوئی پناہ نہیں دی جائے گی اور نہ اس کو جو انہیں مدد دے۔

(44) اور ان (یہودیوں اور مسلمانوں) میں باہم مدد دہی ہوگی اگر کوئی یثرب پر ٹوٹ پڑے۔

(45-الف) اور اگر ان کو کسی صلح میں مدعو کیا جائے تو وہ بھی صلح کریں گے اور اس میں شریک رہیں گے اور اگر وہ کسی ایسے ہی امر کے لیے لائیں تو مؤمنین کا بھی فریضہ ہوگا کہ ان کے ساتھ ایسا ہی کریں، بجز اس کے کہ کوئی دینی جنگ کرے۔

(45-ب) ہر گروہ کے حصے میں اسی رُخ کی (مدافعت) آئے گی جو اس کے بالمقابل ہو۔

(46) اور (قبیلہ) الاؤس کے یہودیوں کو جو موالی ہوں کہ اصل، وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اس دستور والوں کو اور وہ بھی اس دستور والوں کے ساتھ خالص وفا شعاری کا برتاؤ کریں گے۔ اور وفا شعاری ہوگی نہ عہد شکنی۔ جو جیسا کرے گا ویسا خود ہی بھرے گا۔ اور خدا اس کے ساتھ ہے جو اس دستور کی مندرجات کی زیادہ سے زیادہ صداقت اور زیادہ سے زیادہ وفا شعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

(47) اور یہ کہ حکمنامہ کسی ظالم یا عہد شکن کے آڑے نہ آئے گا۔ اور جو جنگ کو نکلے تو بھی امن کا مستحق ہوگا اور جو مدینے میں بیٹھ رہے تو بھی امن کا مستحق ہوگا ورنہ ظلم اور عہد شکنی ہوگی۔ اور خدا اس کا نگہبان ہے جو وفا شعاری اور احتیاط (سے تعمیل عہد) کرے اور اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی جن پر خدا کی توجہ اور سلامتی ہو۔

IV

اسلام میں ریاست کا تصور

اسلامی ریاست کہلانے کی مستحق میرے نزدیک وہی ایک تھی جس کا مشاہدہ مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور مسعود میں کیا کیونکہ ایک طرف فرمانِ خداوندی ہے:

''یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں (پیروی کے لیے) بہترین نمونہ موجود ہے'' (21-33)

تو دوسری جانب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی ہے

''تم پر میرے طریقہ اور میرے بعد خلفائے راشدین کی پیروی لازمی ہے'' (ابوداؤد 5/39)

سیاسی زندگی کو اس فرمان کی پابندی سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ خوش قسمتی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے معاملات کے علاوہ ریاست کی تشکیل اور اسے چلانے کے حوالے سے اپنا نمونہ ہمارے لیے چھوڑا ہے۔

ریاست تاریخ کے آئینے میں

قرآن کریم (90-83/6) میں بعض پیغمبران عظام کا انتہائی تکریم کے ساتھ تذکرہ کرنے کے بعد خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

''یہی لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت بخشی اس لیے آپ بھی

انہی کا طریق اختیار کیجیے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم)۔"

اس طرح سابقہ پیغمبروں کا طرز عمل اور طریقہ بھی مسلمانوں میں بروئے عمل رہا ماسوائے اس کے کہ بعد میں آنے والے پیغمبروں کی تعلیمات نے اسے تبدیل یا منسوخ کر دیا۔ انسانی معاشرے کی گذشتہ تاریخ کے مطالعے میں ہماری توجہ کا مرکز ریاست کا ادارہ رہے گا۔

باور کیا جاتا ہے کہ ابتدا میں انسان چھوٹے مگر الگ اور خود مختار خاندانوں کی شکل میں رہتے تھے جو عموماً باپ، ماں اور چھوٹے بچوں پر مشتمل ہوتا تھا تاہم بعض اوقات معمر دادا دادی یا نانا نانی بھی ان کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض خاندانوں نے طاقتور دشمنوں سے تحفظ کی خاطر ایک جگہ اکٹھے رہائش اختیار کر لی اور کنبہ بنا کر رہنے لگے۔ وقت اور ضروریات نے انہیں مزید مرکزیت پر مجبور کر دیا اور وہ قبائل کی شکل میں منظم ہو گئے۔ ان قبائل نے بعد ازاں شہری ریاستوں کی شکل اختیار کر لی جو آہستہ آہستہ مکمل ریاستوں اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ سلطنتوں میں تبدیل ہو گئیں۔ بعض مہم جوؤں نے وقتاً فوقتاً ایک عالمگیر سلطنت اور حکومت قائم کرنے کی کوششیں کیں لیکن یہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکیں اور اس خواب کو کبھی تعبیر نہ مل سکی۔ بائبل کی رائے اس حوالے سے یہ ہے:

"تم پر حکمران بادشاہوں کا وطیرہ یہ ہو گا کہ وہ تمہارے بیٹوں کو تم سے چھین لے گا اور انہیں اپنی خدمت کے لیے اور بعض کو اپنی رتھوں پر سائس بنا کر ملازم رکھے گا اور ان میں بعض اس کی رتھوں کے آگے (سپاہیوں کے طور پر) دوڑیں گے اور بعض کو وہ ہزاروں سپاہیوں کے اوپر افسر بنائے گا اور بعض کو چھوٹے دستوں پر افسر مقرر کرے گا۔ بعض کو وہ اپنی زمینوں میں فصلیں بونے اور بعض کو فصلیں (پکنے کے بعد) سمیٹنے کی ذمہ داری تفویض کرے گا جبکہ بعض کو وہ جنگی ہتھیار بنانے پر مامور کرے گا اور بعض سے اپنی رتھوں کے لیے اجزا تیار کرائے گا۔ تمہاری بیٹیوں کو وہ اپنے لیے اشیائے خورد و نوش تیار کرنے پر لگائے گا جو ان کے لیے کھانے اور مٹھائیاں تیار کریں گی۔ وہ تمہارے کھیتوں پر بھی قبضہ کر لے گا اور انگور اور زیتون کے بہترین باغات بھی اپنی تحویل میں لے لے گا۔ ان میں سے بعض کو اپنے ملازمین کے حوالے کر دے گا۔ وہ تمہاری زرعی پیداوار کا دسواں حصہ اور انگور

کے باغات کا بھی دسواں حصہ تم سے لے کر اپنے افسروں اور ملازموں کو دے دے گا۔ وہ تمہارے غلاموں اور لونڈیوں کو بھی تم سے لے لے گا اور تمہارے شہ زور مردوں اور گدھوں کو تم سے چھین کر اپنے کام میں لگا دے گا۔ وہ تم سے تمہاری بھیڑوں کا دسواں حصہ بھی حاصل کرے گا اور تم اس کے غلام بن کر کام کرو گے اور تم اس روز بادشاہ کے طرز عمل پر آنسو بہاؤ گے اور (کیونکہ) تم نے بادشاہ کو خود چنا ہو گا اس لیے خداوند اس روز تمہاری کوئی بات نہیں سنے گا۔''

اس کے باوجود لوگوں نے پیغمبر کی بات سننے سے انکار کر دیا۔ بائبل مزید کہتی ہے:

''پھر سیموئیل نے لوگوں کو حکومت چلانے کا طریقہ سکھایا اسے ایک کتاب میں لکھا اور اسے خداوند کو پیش کر دیا۔ (I سیموئیل 25/10)

گو بظاہر یہ لوگوں کو حکومت سے برگشتہ کرنے کا مضحکہ خیز طریقہ معلوم ہوتا ہے تاہم اگر یہ سچ ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک 'ریاست کا تحریری آئین' ایک سابقہ پیغمبر کی سنت میں موجود ہے۔

اشموئیل پیغمبر نے جس بادشاہ کو نامزد کیا قرآن میں اس کا نام طالوت اور بائبل میں ساؤل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ طالوت اس کا لقب ہو جس کا مطلب بڑا سردار یا بادشاہ ہے۔ طالوت کے بعد ان کے داماد داؤد (علیہ السلام) کو اقتدار حاصل ہوا۔ قرآن میں انہیں پیغمبر اور بادشاہ دونوں خصوصیات کا حامل قرار دیا گیا ہے جبکہ بائبل کے مطابق وہ صرف بادشاہ تھے۔ ان کی جانشینی کا اعزاز ان کے صاحبزادے سلیمان (علیہ السلام) کو حاصل ہوا جو قرآن کے مطابق بادشاہ بھی تھے اور پیغمبر بھی جبکہ بائبل میں انہیں صرف بادشاہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں مذکور ہے:

''سلیمان داؤد کے وارث تھے۔'' (15/27)

بیٹے نے باپ کی سلطنت ورثے میں حاصل کی۔ باپ اور بیٹا دونوں پیغمبر تھے اس لیے اسلام میں ان کے طرز عمل کو ہدف تنقید بنانے کا کوئی سوال نہیں۔

سلیمان (علیہ السلام) سے ملکہ سبا (بائبل کے مطابق شیبا) بلقیس کی مشہور کہانی بھی منسوب ہے۔ سبا کا علاقہ آج یمن کا حصہ ہے۔ قرآن کے مطابق (33-32/27) اس

نے ایک مجلس شوریٰ بنا رکھی تھی۔ اور یہ کہ اسے ویٹو کا اختیار حاصل تھا اس کے علاوہ یہ کہ

"اس نے حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا تھا۔" (27-44)

بظاہر وہ اس کے بعد یمن واپس چلی گئی اور اپنی موت تک اپنی مملکت کی حکمران رہی۔ قرآن مجید میں اس کی رائے مذکور ہے جو اس کے تجربہ اور سیاسی علم اور فراست کی غمازی کرتی ہے۔

"جب بادشاہ کسی شہر (مفتوحہ) میں داخل ہوتے ہیں تو وہ اسے تباہ کر دیتے ہیں اور اسکے باعزت لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور یہ بھی ایسا ہی کریں گے۔" (34/27)

فطری بات ہے کہ اچھے اور برے لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں لیکن ملکہ سبا کی رائے کا حوالہ دینے کے باوجود قرآن کا منشا یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بادشاہت کوئی قابل مذمت نظام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام بھی تو بادشاہ تھے۔ ضمناً یہاں یہ حقیقت بھی اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ قرآن ایک خاتون کے سربراہ مملکت ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ جہاں تک حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس معروف حدیث کا تعلق ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا کہ ایران میں ایک عورت کو حکمران بنایا گیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے اپنے (سیاسی) معاملات عورت کے سپرد کر دیئے۔" تو یہ حدیث بھی عورت کے حکمران بننے کی ممانعت نہیں کرتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ایک پیش گوئی تھی جو بہت جلد پوری بھی ہو گئی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اصول یا ضابطہ نہیں بنایا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فلسطین میں پیدا ہوئے جو اس وقت رومن سلطنت کے زیرنگیں تھا۔ وہ سیاست کو اس حد تک ناپسند کرتے تھے کہ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ "میری سلطنت کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں" [(بحوالہ سینٹ جان (انجیل - یوحنا) 36/16)] گو کہ لوقا کی انجیل میں اس سے متضاد بیان موجود ہے "(لیکن) میرے ان دشمنوں کو جو نہیں چاہتے کہ میں ان پر حکومت کروں یہاں لایا جائے اور میرے سامنے قتل

کر دیا جائے۔" (سینٹ لوقا 19-27)۔ اب کون سی (انجیل) اختلاف (حقائق سے) کر رہی ہے اور اختلافی معاملہ کیا ہے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

ظہور اسلام کے وقت مکہ کی حالت

جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی 569ء میں مکہ میں ولادت باسعادت ہوئی تو دنیا کی سیاسی صورت حال پیچیدہ اور گمبھیر تھی۔ مرکزیت کا فقدان تھا۔ ہر حصے کی کیفیت دوسرے سے مختلف تھی۔ ایک طرف اگر روم کی بازنطینی اور ایران کی ساسانی عظیم سلطنتیں تھیں تو دوسری طرف ان گنت چھوٹی چھوٹی مملکتیں اور ریاستیں دنیا بھر میں بکھری ہوئی تھیں۔ ان سب میں سے ایبے سینیا (حبشہ) کی حکومت کے عربوں سے قریبی تعلقات تھے۔ اس وقت مکہ ایک چھوٹی سی شہری ریاست کی حیثیت رکھتا تھا جبکہ مدینہ میں کوئی مرکزی انتظامیہ یا حکومت کا وجود نہ تھا بلکہ اس کے برعکس جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مصداق بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ خانہ بدوش قبائل پورے جزیرہ نما عرب میں مصروف سفر رہتے تھے اور جہاں انہیں بود و باش کے لیے سازگار حالات نظر آتے وہیں پڑاؤ ڈال دیتے۔

مکہ میں بھی کوئی بادشاہت یا عوامی رائے سے منتخب حکومت نہ تھی بلکہ (العقد الفرید از عبد ربہ) کے مطابق یہاں معاملات یک گونہ خودمختار سرداری نظام کے تحت چلائے جا رہے تھے۔ شہر میں دس سرکردہ قبائل کی عملداری تھی جن میں سے ہر ایک کا سردار وراثت میں ملنے والی درج ذیل ذمہ داریاں اٹھائے ہوئے تھا:

1. حاجیوں کے لیے پینے کے پانی کا انتظام
2. جنگ میں پرچم اٹھانا
3. حاجیوں کی میزبانی کے لیے ٹیکس جمع کرنا
4. جنگ میں اتحادیوں کے ساتھ قومی پرچم کی علمبرداری اور ایوان پارلیمنٹ پر ٹھہرانا

5. سینیٹ (دارالندوہ کی صدارت)
6. تنازعات کی صورت میں نظام انصاف
7. جنگ کے موقع پر فوجی کیمپ اور شہسواروں کی قیادت
8. سفارت (بیرونی ممالک سے تعلقات)
9. فال گیری اور قسمت دریافت کرنے کے لیے بتوں کے تیروں کی تولیت
10. فوجداری مقدمات کے فیصلے اور کعبہ میں پیش کئے جانے والے نذرانوں کا حساب کتاب۔

ان میں سے (1) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے لیے مخصوص تھا جبکہ (2) کی ذمہ داری ابوسفیان کے خاندان کے سپرد تھی۔ (4) کے معاملات مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے قبیلے کے کندھوں پر تھے جبکہ (6) کی ذمہ داری ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا خاندان نبھاتا تھا۔ (7) کے معاملات خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے قبیلے بنومخزوم کے ذمہ تھے اور (8) کے نگران حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے قبیلے بنوعدی والے تھے۔ اسی طرح مختلف ذمہ داریاں مختلف قبائل کو سونپ دی گئی تھیں۔

ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عمیر نے ہجرت سے قبل ہی اسلام قبول کرلیا تھا۔ ان کی شہری انتظامیہ میں کیا حیثیت تھی۔ اس کے بارے میں علم نہیں نہ ہی یہ واضح ہے کہ یہ ''وزراء'' اپنے فیصلے کونسل (شوریٰ) کے مشورے سے کرتے تھے یا وہ شہر کے مفاد میں انفرادی فیصلے کرنے میں آزاد تھے۔

ان ''سرکاری'' ارکان کے علاوہ کم ازکم چار ''ایسوسی ایٹ'' ارکان بھی تھے۔ ان کا تعلق قریش سے نہیں تھا۔ ان چار ارکان میں (1) انجینئر انچیف (2) کاھن اعظم (3) اور (4) حج کے دوران عرفات اور مزدلفہ میں ارکان حج کی ادائیگی کے نظم و نسق کے نگران شامل تھے۔ انجینئر انچیف کعبہ کی تعمیر و تزئین کے انتظامات کے ذمہ دار تھے جبکہ کاھن اعظم قمری کیلنڈر کا تعین کرتے تھے تاکہ حج کے مہینوں میں کسی قسم کا ابہام پیدا نہ ہو۔

قبیلے کے سربراہ کے انتخاب کا معیار اور طریق کار کیا تھا اس بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ عام طور پر سربراہ کے انتقال پر قبیلے کے معتبرین جمع ہوتے اور اسے

میں سے عمر، فہم و فراست اور مالی خوشحالی کی بنیاد پر کسی ایک کو منتخب کر لیتے۔ بعض اوقات متوفی سربراہ کی طرف سے اپنے جانشین کی نامزدگی کو بھی قبول کر لیا جاتا تھا۔

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ عبدالمطلب بنو ہاشم کے سردار تھے اور ان کے بعد ان کے بیٹے ابو طالب ان کے جانشین بنے۔ بعد میں ابو طالب نے زمزم کا کنواں اپنی مالی مشکلات رفع کرنے کے لیے اپنے چھوٹے مگر آسودہ حال بھائی عباس کو فروخت کر دیا۔ تاہم ابو طالب کے انتقال کے بعد ان کے بھائی ابولہب نے جو قبیلے کا سربراہ بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے انکار کیا اور انہیں ان کے بنیادی شہری حقوق سے محروم کرنے کی کوشش کی اور اس کے نتیجے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بالآخر اپنا وطن چھوڑنے پر بھی مجبور ہوئے۔

اسلامی ریاست

دسمبر 609 میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی کے نزول کے ساتھ ظہور اسلام کے آغاز کے وقت ابو طالب بنو ہاشم کے سربراہ تھے اور اس طرح 10 رکنی مجلس شوریٰ کے رکن بھی۔ مگر ان کی یہ حیثیت باقی ارکان شوریٰ کو بنو ہاشم کے سماجی بائیکاٹ سے روکنے میں معاون ثابت نہیں ہوئی اور ایک متفقہ فیصلے کے تحت بنو ہاشم سے بول چال، لین دین اور شادی بیاہ کے رشتوں کی ممانعت کر دی گئی اور ابو طالب اور متعلقین کو شہر چھوڑ کر مضافات میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا گیا۔ ابولہب کے سوا خاندان بنو ہاشم کے تمام افراد نے خواہ وہ مسلمان ہو چکے تھے یا ابھی ان کے دل نور ہدایت سے روشن نہیں ہوئے تھے ابو طالب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا اور تمام مصائب کو پامردی سے برداشت کیا۔

اسلام سے قبل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے معمول کی شہری زندگی گذاری اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر اپنے ہم عصروں میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ لوگوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے پناہ احترام حاصل تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے لوگوں کے شانہ بشانہ قومی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے مثلاً کعبہ کی تعمیر نو

کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ حصہ لیا اور جب حجر اسود کو اس کی جگہ نصب کرنے کے موقع پر تنازعہ کھڑا ہوا تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات تھی جس نے انتہائی فراست سے اس مسئلے کو سلجھایا مگر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو درجۂ نبوت پر فائز کیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نئے دین کی تبلیغ شروع کی تو یہ سب لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن بن گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مٹھی بھر جانثار پیروکاروں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ فطری بات تھی کہ مسلمان اپنے تمام معاملات میں خواہ وہ مذہبی نوعیت کے تھے یا ان کا تعلق روزمرہ کی زندگی سے تھا اپنے روحانی قائد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہی رجوع کرتے تھے اور روائتی کونسل یا شوریٰ کی اب ان کی نظروں میں کوئی اہمیت نہ تھی۔ گویا یہ کیفیت ''ریاست در ریاست'' کی ایک شکل اختیار کر چکی تھی۔ مسلمانوں کے لیے فطری طور پر اپنے امیر کی اطاعت سب سے اہم تھی اور وہ انہی کے احکام پر عملدرآمد کو ہی ضروری سمجھتے تھے۔ اب ان کے پاس قرآن کی شکل میں ایک قانون بھی موجود تھا جس کے فرامین وحی کے ذریعہ بتدریج ان تک پہنچ رہے تھے۔ مسلمانوں کے مابین ایک قلبی یکجہتی پیدا ہو چکی تھی اور انہوں نے بتدریج کسی نہ کسی شکل میں اپنے ادارے بھی قائم کر لئے تھے اور اس طرح گویا ریاست در ریاست کے لیے 'علاقہ' بھی پیدا کر لیا تھا۔ اس 'مسلم مملکت' کے مکہ کی غیر مسلم ریاست سمیت دوسرے ممالک سے تعلقات بھی قائم ہو چکے تھے اور جب مسلمانوں پر اہل مکہ کے مظالم میں شدت پیدا ہو گئی اور خواتین سمیت چند مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروکاروں کو عیسائی ریاست، حبشہ میں پناہ لینے کی ہدایت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کرنے والے پہلے گروپ کے ہاتھ حبشہ کے بادشاہ کو جو خط بھیجا اس کے چند مندرجات ذیل میں دئے جا رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا

''میں اپنے عم زاد جعفر کو کچھ مسلمانوں کے ہمراہ آپ کے پاس بھیج رہا ہوں جب یہ لوگ آپ کے پاس آئیں تو ان سے شفقت کا سلوک کریں اور ان پر کسی قسم کی زیادتی نہ کریں۔''

کفار مکہ نے ان کا پیچھا کیا اور اپنے سفیر کو حبشہ بھیجا تا کہ ان مسلمانوں کو واپس لایا جائے مگر حبشہ کے شاہ نجاشی نے یہ مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

مشرکین مکہ نے بنو ہاشم کا جو بائیکاٹ کیا تھا وہ کئی تکلیف دہ ماہ و سال کے بعد اپنے انجام کو پہنچا۔ اس کے بعد جلد ہی آپ کے جانثار چچا ابو طالب اور غمگسار شریک حیات خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یکے بعد دیگرے مختصر وقفوں سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ابو لہب نے جو بعد ازاں قبیلے کا سربراہ بنا، بغیر خاندان کے دوسرے افراد سے مشورہ کئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاندانی تحفظ اور شہریت سے محروم کر دیا جس پر وہ دُور پار رشتہ داروں کے ہاں پناہ حاصل کرنے طائف تشریف لے گئے مگر کوئی شخص انہیں پناہ دینے پر تیار نہ ہوا جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ واپس آنا پڑا مگر اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں آزادانہ داخل ہونے کا حق حاصل نہ رہا تھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ کے شہری ہونے کا حق سلب کر لیا گیا تھا۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخلہ کے لیے مکہ کے ایک آزاد اور مکمل شہری جو اگرچہ غیر مسلم تھا (مطعم بن عدی) کی پناہ حاصل کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تبلیغ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم قدرت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طرح مدد کی کہ حج کا موسم آ گیا اور چونکہ ایام حج میں قتل یا خون بہانے کی ممانعت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فائدہ اٹھایا اور دوسرے علاقوں سے آنے والے زائرین کعبہ کو اسلام کا پیغام پہنچاتے رہے۔ اس دوران مدینہ (یثرب) کے چھ خوش نصیب دولت اسلام سے مالا مال ہوئے اور انہوں نے واپس جا کر اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ اگلے سال حج کے موقع پر ایک درجن سے زیادہ یثربیوں نے اسلام قبول کر لیا اور اس طرح اسلامی ریاست کی بنیاد کی پہلی اینٹ رکھ دی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے ان نومسلموں کے لیے بارہ سردار (نقیب) مقرر کر دیئے جن میں سے ہر ایک اپنے قبیلے کی نمائندگی کرتا تھا اور اسعد بن زرارہ کو ان سب کا سردار (نقیب النقبا) مقرر فرمایا۔ ان کی حیثیت ایک طرح سے رسول اللہ کی طرف سے نامزد نمائندہ (وائسرائے) کی تھی۔ مسلمانان یثرب کی درخواست پر حضرت مصعب رضی اللہ عنہ بن عمیر کو مبلغ کی حیثیت سے ان کے ہمراہ بھیج دیا گیا تا کہ وہ لوگوں کو اسلام کی تعلیمات سے

روشناس کرائیں۔ ان کی کوششوں کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی اور اگلے سال حج کے موقع پر یثرب کے 72 افراد ایمان لے آئے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کر کے مدینہ آنے اور وہیں مستقل قیام فرمانے کی درخواست کی جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرف قبولیت بخشا۔

دریں اثناء دو قابل ذکر واقعات ہوئے۔ ایک یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت تک نازل شدہ قرآن کریم کی آیات کاغذ پر نقل کروا کر اہل مدینہ کو عنائت کیں جو انہیں ہمراہ لے گئے اور وہاں مجمع عام میں ان کی تلاوت کی۔ اسے بجا طور پر قانون اسلام کا پہلا ضابطہ کہا جا سکتا ہے۔ دوسرا یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عمیر کو پیغام بھجوایا جس میں انہیں ہدائت فرمائی کہ وہ جمعہ کے روز تمام مردوں، عورتوں اور بچوں کو جمع کریں اور انہیں خطبہ کے ساتھ دو رکعت نماز ظہر پڑھائیں۔ اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ چیزیں نہیں ہیں دونوں کا منبع اور ماخذ ایک ہے یعنی قرآن۔

مدینہ کی شہری ریاست

مکہ کے برعکس مدینہ میں چھوٹی یا بڑی کوئی ریاست نہیں تھی۔ صرف قبائل تھے جو جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے قانون پر عمل پیرا ہر وقت آپس میں برسرپیکار رہتے تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم 622ء میں مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کی بحالی کی طرف توجہ فرمائی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو [illegible] اور فوری کامیابی نصیب ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے ایک [illegible] کے ساتھ مکہ کے ایک خاندان کی مواخات قائم کر دی اور تجویز فرمایا کہ دونوں [illegible] کر کام کریں گے [illegible] کمائیں گے اور نسبی رشتہ داروں کی بجائے آپس میں ایک [illegible] وراثت کے حقدار [illegible] ہوں گے تاہم وراثت کا یہ حکم بعد میں منسوخ کر دیا گیا۔

[illegible] کے بعد رسول [illegible] صلی اللہ علیہ وسلم کو شہر کی سکیورٹی اور دفاع کے معاملات [illegible]

طرف متوجہ ہونا پڑا کیونکہ مشرکین مکہ نے اہل مدینہ کو یہ الٹی میٹم بھجوایا کہ ''ہمارے دشمن (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دو (نعوذ باللہ) یا شہر سے نکال دو ورنہ ہم خود کوئی کارروائی کریں گے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم اور غیر مسلم تمام قبائل کے سرداروں کو بلوایا اور تجویز کیا کہ وفاقی طرز کی ایک شہری ریاست تشکیل دی جائے جس میں ہر رکن قبیلہ کو اندرونی خودمختاری حاصل ہو جبکہ دفاع سمیت کچھ ضروری اختیارات مرکزی انتظامیہ کے پاس ہوں۔ تقریباً سب نے رضامندی ظاہر کی چنانچہ تمام شریک نمائندوں کے مشورے سے ریاست کا تحریری آئین تیار کیا گیا۔ یہ آئین جو ہم تک پہنچا ہے دنیا کی تاریخ میں درحقیقت کسی سربراہ ریاست کا وضع کردہ قدیم ترین تحریری دستور ہے۔ دستور کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہودیوں نے بھی شہری ریاست کو تسلیم کیا تھا اور ایک شق میں ان کی اندرونی خودمختاری اور مسلمانوں کی طرح مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی تھی۔ انہیں نہ صرف مذہبی آزادی حاصل تھی بلکہ وہ اپنے قانون اور عدالتی معاملات میں بھی خودمختار تھے۔ تنازعہ کے فریق یہودی ہونے کی صورت میں ان پر اسلامی قوانین کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا حتیٰ کہ وہ اسلامی عدالت میں اپیل بھی نہ کر سکتے تھے۔ دستور میں سماجی انصاف کی یقین دہانی کے ساتھ غیر ملکی (حملہ آوروں) کے خلاف مکمل یکجہتی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ کسی ایک طبقے کا دشمن دوسرے تمام طبقوں اور معاہدے کے تمام فریقوں کا بھی دشمن گردانا گیا۔ حقوق شہریت دینے کا اختیار نہ صرف مرکز کو دیا گیا بلکہ ہر شہری کو یہ حق دیا گیا کہ وہ کسی بھی غیر ملکی کے ساتھ بھائی چارہ قائم کر کے اسے بالکل اسی طرح حق شہریت عطا کر سکتا ہے جیسا کہ خود اسے حاصل ہے۔

چونکہ اس سے قبل مدینہ میں کوئی ریاست موجود نہ تھی اس لیے تمام انتظامی ڈھانچہ قائم کیا جانا تھا اور چونکہ مدینہ کے لوگوں میں گوناگوں تنازعات تھے اس لیے ایک ''غیر ملکی'' کو جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات تھی آسانی سے سربراہ ریاست قبول کر لیا گیا۔ اس دستوری دستاویز میں اور تاریخ میں بھی اس حوالے سے پوری صحت اور باریک بینی کے ساتھ تفصیلات موجود نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں نے [illegible] طور پر ایک ریاست قائم کر لی ہو جس کے فطری سربراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی

ہو سکتے تھے اور دوسرے عناصر مثلاً یہودیوں اور بت پرست عربوں کو اس میں شامل ہونے کی دعوت دے دی گئی ہو کہ وہ بھی اس کے فیوض سے بہرہ مند ہوں۔ مدینہ میں انتظامیہ قائم کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی سرگرمی سے گرد و نواح کے دورے کیئے اور غیر مسلم قبائل کو نئی قائم ہونے والی ریاست سے فوجی تعاون پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس طرح اپنی فوجی قوت میں اضافہ کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم جاری کر دیا کہ اہل مکہ کا کوئی تجارتی قافلہ مسلمانوں کے علاقے سے نہیں گزرے گا۔ اس حکم کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جانا چاہیے کہ مکہ سے شام، عراق اور مصر تک جانے والے قافلوں کا راستہ مدینہ کے پاس سے گزرتا تھا۔ اہل مکہ نے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا اور بزور طاقت قافلے گزارنے کی کوشش کی جن کے نتیجے میں بدر، احد اور پھر خندق کی جنگیں ہوئیں جنہوں نے مکہ والوں کو نڈھال کر دیا۔ آخر کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کو انہی کی شرائط پر امن معاہدے کی پیشکش کی اور معاہدہ حدیبیہ عمل میں آیا۔ اس معاہدے نے عملی طور پر مشرکین مکہ کو خیبر کے یہودیوں سے الگ کر دیا۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بے مثال حکمت عملی سے اپنے دونوں دشمنوں سے وقتی طور پر نجات حاصل کر لی۔ معاہدے کے نتیجے میں اہل مکہ پابند ہو گئے کہ وہ مسلمانوں کے کسی تیسرے فریق سے تنازعہ کی صورت میں غیر جانبدار رہیں گے۔ معاہدے کے چند ہی ہفتے بعد معرکہ خیبر پیش آیا اور مسلمانوں نے مکہ کی طرف سے کسی بھی خطرے سے بے نیاز ہو کر جنگ لڑی اور فتح یاب ہوئے۔ اور بعد ازاں جب اہل مکہ نے معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی کی تو اس کی سزا کے طور پر مسلمانوں نے ان کے خلاف فوج کشی کی اور بغیر خونریزی کے مکہ پر قبضہ کر لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فوجی اور سیاسی فراست نے ایک انہونی کو ہونی کر دکھایا۔

(مکہ پر لشکر کشی کے لیے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے اپنی فوجی قوت کو مدینہ میں مجتمع کرنے کی بجائے ہدائت کی کہ سب لوگ اپنے اپنے مقامات پر مکمل تیاری کی حالت میں ٹھہریں اور جب اذن سفر دیا تو سیدھے راستوں کی بجائے پیچدار راہوں کا انتخاب کیا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ مہم کا رُخ کس جانب ہے اور منزل مقصود کون سی ہے۔ اس

طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں بھی قیام کیا جانثاروں کی کمک برابر ملتی رہی اور آخرکار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے مضافات میں پڑاؤ ڈال دیا اور اہل مکہ کو بے خبری میں جالیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ بغیر کسی خونریزی کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضے میں آ گیا۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثال فوجی حکمت عملی تھی جو مکمل طور پر کامیاب رہی۔

فتح مکہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی حکمت عملی نے کام کر دکھایا۔ مکہ کی گلیوں میں نقیب اعلان کرنے لگے کہ جو ہتھیار ڈال دے گا اسے امان ہے، جو اپنے گھر کے دروازے بند کر لے گا اسے بھی امان ہے، جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے لے گا وہ بھی امان پائے گا (اس اعلان نے اہل مکہ کے حوصلے پست کر دیئے کہ ابوسفیان بھی اسلام قبول کر چکا ہے؟) جو بیت اللہ کے صحن میں داخل ہو جائے گا وہ بھی امان میں ہے۔

پھر اعلان ہوا کہ سب لوگ جمع ہو جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ تمام لوگ جمع ہو گئے جس میں مسلمان اور مشرک دونوں شامل تھے۔ اس وقت ظہر کا وقت تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیت اللہ کی چھت پر چڑھ گئے اور اذان دی۔ جب وہ شہادہ (اشہد اللہ لا الہ الا اللہ واشہد ان محمد رسول اللہ) پر پہنچے تو ایک مشرک عتاب بن اسید نے اپنے ساتھی سے سرگوشی کی کہ خدا کا شکر ہے میرا باپ زندہ نہیں ورنہ وہ اس کالے حبشی (اس نے سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں دریدہ دہنی کی) کے یہ کلمے سن کر اسے تکلیف ہوتی۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین مکہ سے خطاب فرمایا اور انہیں ان کی زیادتیاں یاد دلائیں جو انہوں نے گذشتہ بیس سال میں مسلمانوں سے روا رکھی تھیں اور پھر ان سے سوال کیا کہ ''اے اہل قریش تمہارا کیا خیال ہے۔ میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں؟'' انہوں نے شرمندگی سے سر جھکا دیئے اور کہا ''آپ کریم بھائی ہیں اور کریم بھائی کے صاحبزادے ہیں ہم آپ سے کریمانہ برتاؤ کی ہی توقع کرتے ہیں۔'' اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخی جملہ ارشاد فرمایا۔ آپ نے فرمایا ''تو میں تم سے وہی بات کہہ رہا ہوں جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی کہ آج تم پر کوئی سرزنش نہیں **لا تثریب علیکم الیوم** جاؤ تم سب آزاد ہو۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اہل مکہ کے لیے غیر متوقع تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے قتل عام کا بھی حکم دے سکتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا حق اور طاقت رکھتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مال پر قبضہ کر سکتے تھے انہیں غلام بنا سکتے تھے مگر اس کی طاقت ہونے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریا دلی اور کرم کا مظاہرہ کیا۔ جونہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بات ختم کی عتاب بن اسید تیزی سے اٹھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھا۔ بلند آواز سے کہنے لگا ”یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں عتاب ہوں (آپ کا بدترین دشمن) اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمد الرسول اللہ۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فراست کا اعجاز تھا کہ راتوں رات پورا مکہ مسلمان ہو گیا اور دشمنی اور مخاصمت کے تمام بادل چھٹ گئے۔

اس کے بعد زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ سرزمین عرب کے دوسرے علاقوں تک جن میں فلسطین اور عراق کے جنوبی حصے شامل تھے بلالی آذانیں گونجنے لگیں۔ دو سال بعد 632ء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیائے فانی سے تشریف لے گئے اور اپنے پیچھے ایک منظم اور مستحکم ریاست چھوڑ گئے۔

نظام حکومت

اگر جمہوریت سے مراد یہ ہے کہ حاکمیت اعلیٰ انسان یعنی عوام کی ہے تو اسلامی ریاست جمہوری نہیں ہو سکتی کیونکہ (مسلمانوں کے نزدیک) حتمی اختیار و اقتدار اللہ کا ہے مجھے ”تھیوکریسی“ کا لفظ استعمال کرنے میں قدرے تامل ہے کیونکہ آج اس کے ایسے معانی سمجھے جا رہے ہیں جو اسلامی طرز سیاست پر پوری طرح منطبق نہیں ہوتے۔ اور اگر جمہوریہ سے مراد یہ ہے کہ سربراہ ریاست کا انتخاب ایک مقررہ مدت کے لیے ہو جس کے بعد ایک نیا الیکشن کروانا ضروری ہو تو اسلامی ریاست میں یہ روائت نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تھی نہ ہی اس کی مثال دور خلافت میں ملتی ہے۔ جہاں تک موروثی بادشاہت کا تعلق ہے جس میں ایک بادشاہ کے انتقال کے بعد اس کے جانشین کو تخت و تاج

نصیب ہوتا ہے تو اسے بھی اسلامی ریاست سے کوئی علاقہ نہیں۔

پیغمبر کو اللہ تعالیٰ تاحیات مبعوث فرماتا ہے اور لوگ انفرادی طور پر ایمان لا کر یا بیعت کر کے ان کی اس حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء مطلق العنان حاکم نہ تھے بلکہ وہ ایک ناقابل تبدیل قانون (قرآن اور حدیث) پر عملدرآمد کے پابند تھے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ خلفائے راشدین کا دور بادشاہت، جمہوریت اور تاحیات انتخاب کا ایک امتزاج تھا اور یہ نظام عرب قبائل کے نظام سے مماثلت رکھتا تھا جس میں سردار قبیلہ کا انتخاب تاحیات ہوتا تھا۔

نظام حکومت وحدانی (مرکزیت کا حامل) (Unitary) یا مخلوط (Composite) ہوسکتا ہے مگر مدینہ کی اسلامی ریاست اپنے ڈھانچے کے حوالے سے وحدانی نہ تھی۔ اس میں خودمختار یہودی قبائل بھی تھے جن کے بارے میں مرکزی حکومت کو بہت کم اختیارات حاصل تھے اور میرے نزدیک وہ نظام وفاقی بھی نہ تھا بلکہ اسے نیم وفاقی (Confederal) کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ پورے کے پورے قبائل مسلمان ہو جاتے تھے اور انہیں بڑی حد تک اندرونی خودمختاری حاصل ہوتی تھی۔ انہیں صرف قرآنی احکام کی خلاف ورزی نہ کرنے کا پابند کیا جاتا تھا۔ کچھ پابندیاں بعد میں لاگو ہوئیں۔

5 ہجری کے لگ بھگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوذہ بن علی ذوالتاج حاکم نجد اور جیفر اور اس کے بھائی عبد کو جو دونوں اومان کے شریک حاکم تھے خطوط ارسال فرمائے۔ دونوں بھائیوں کے والد کا نام الجلندہ (یا الجلندی) تھا۔ ان خطوط میں انہیں یقین دہانی کرائی گئی کہ اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو ان کے اقتدار سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا اور وہ اندرونی معاملات چلانے میں مکمل طور پر آزاد ہوں گے۔ جیفر اور عبد دونوں نے اسلام قبول کرلیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عاص کو ان کے دربار میں اپنا نمائندہ (ریذیڈنٹ) متعین فرمایا جنہوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے معاملات اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے وقف کر دیا۔ ایک خط منذر ابن ساوہ حاکم بحرین کو بھجوایا گیا جس کی حیثیت ایرانی حکومت کے ایک گورنر کی تھی۔ اس نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ اسے اسلامی حکومت کے ایک قسم کے وائسرائے کی حیثیت سے اپنے تخت پر برقرار رکھا

گیا۔ یمن میں باذان کی حیثیت فارس کے گورنر کی تھی جب اس نے اسلام قبول کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بھی اپنے منصب پر برقرار رکھا اور اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے کو بھی اس کا جانشین اور اسلامی حکومت کے گورنر کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔

تاہم اس معمول سے استثنیٰ کا ایک کیس بھی ہے۔ شاہان حبشہ میں سے ایک نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا کیونکہ اس کے انتقال پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اس کی غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی۔ تاہم روایات سے ایسے آثار نہیں ملتے کہ اس نے مدینہ کی اسلامی حکومت کی انتظامی سیادت بھی قبول کی تھی۔ (حالانکہ اس کا انتقال 9 ہجری میں ہوا تھا جب مدینہ کی اسلامی ریاست کافی مستحکم ہو چکی تھی۔ مترجم)

مدینہ کی اسلامی ریاست کی حکومت کوئی نمائندہ حکومت (Collegial) نہ تھی تاہم اس کا موقع پیدا ہو گیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد انصار نے تجویز کیا کہ انصار اور مہاجرین کے نمائندہ دو خلفاء مقرر کیے جائیں تاہم جلد ہی وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت پر متفق ہو گئے۔

قانون سازی

مسلمانوں کے لیے ابتدا میں کوئی باضابطہ قوانین موجود نہ تھے۔ قرآن بتدریج نازل ہو رہا تھا۔ اس کا حکم یہ تھا کہ "ہر وہ چیز جائز ہے جسے قرآن اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہیں کیا۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں قرآن اور حدیث میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا اس لیے اسلامی قانون کے سرچشموں کی درجہ بندی اس طرح کی جا سکتی ہے:

1. ایسی مروجہ روایات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے الفاظ اور روح سے متصادم نہ ہوں۔ شک کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کیا جاتا۔
2. قرآن جس کے کسی لفظ کو کوئی انسان تبدیل کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔
3. مصدقہ فرامین اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عملی طور پر وہی مقام حاصل

ہے جو قرآن کا ہے۔

4. قرآن اور حدیث کی خاموشی کی صورت میں اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں مسلمانوں کو (قرآن اور حدیث کی روح کے مطابق) قیاس کا اختیار حاصل ہے۔

5. اجماع یا اتفاق رائے کا وجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں نہ تھا (نہ اس وقت اس کی ضرورت تھی۔ مترجم) اس کی ضرورت بعد میں محسوس ہوئی۔ اسے قیاس یا کسی فقیہہ کی انفرادی رائے پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ اجماع کا مطلب ہے کہ معروف فقہاء کا کسی رائے پر متفق ہونا۔ اجماع کو ابھی باضابطہ حیثیت حاصل نہیں ہوئی اور اس لیے کسی معاملے پر پورے یقین سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس پر اجماع ہے یا نہیں۔ امام البز دادی اور امام فخر الدین رازی جیسے عظیم فقہاء کی رائے میں بعد میں ہونے والا اجماع پہلے اجماع کو منسوخ بھی کر سکتا ہے۔

6. سنن من قبلکم: اس اصطلاح کی توضیح مسلمان فقہاء اس طرح کرتے ہیں کہ گذشتہ رسولوں کے قوانین بھی لاگو رہتے ہیں بشرطیکہ (i) بعد میں آنے والے کسی پیغمبر نے انہیں منسوخ نہ کیا ہو خصوصاً قرآن اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور (ii) ان کے وجود اور صحت کی تصدیق ہر شک وشبہ سے بالا ہو (ان کا حوالہ قرآن یا حدیث میں موجود ہو)۔

7. معاہدے کی شرائط: جب تک معاہدہ بروئے عمل ہو اور متعلقہ فریق اس کے پابند ہوں (مثلاً معاہدہ حدیبیہ)۔

8. دوطرفہ یا متوازی ضوابط **(Reciprocity)** حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں موجود تھے۔ ایک دفعہ ایک سرحدی کسٹم افسر نے خلیفہ سے رہنمائی چاہی کہ اسلامی مملکت میں تجارت کے لیے آنے والے بیرونی تاجروں سے کس قدر ٹیکس وصول کیا جائے۔ اس پر اس کو جواب بھجوایا گیا کہ جس قدر مسلمان تاجروں پر ان کے ملک میں داخل ہونے پر وصول کیا جاتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ روائت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں بھی موجود تھی کیونکہ جنگ بدر کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے استفسار فرمایا کہ قریش کا علمبردار کون ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ ان کے ہاں یہ منصب موروثی ہے۔ یہ ذمہ داری بنوعبدالدار کے خاندان کے سپرد ہے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم پر حق اصل حقدار کو دینے کی ذمہ داری زیادہ ہے اور پھر پرچم حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عمیر کے سپرد فرمایا حالانکہ پہلے یہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تھا۔

قانونی اور بالفعل حکومتیں

جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ قبل از اسلام مکہ میں شہری ریاست کا کوئی مرکزی نظام یا حکومت نہیں تھی بلکہ تقسیم کار کا ایک ایسا نظام رائج تھا جس میں مختلف ذمہ داریاں مختلف قبائل کے سپرد تھیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے قتل کی سازش کے بعد مدینہ ہجرت پر مجبور ہونا پڑا تو ایسا تاثر ملتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود اور مہاجرین یہ سمجھتے تھے کہ وہ مکہ کی حکومت کے قانونی حقدار تھے جو انہوں نے مدینہ میں قائم کی اور مشرکین مکہ کی ریاست کی حیثیت بالفعل (یعنی بر سر زمین طاقت کے بل پر قائم) کی سی ہے اور شائد اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر اور احد کی جنگوں میں اسلامی پرچم عبدالدار قبیلے کے حضرت مصعب رضی اللہ عنہ بن عمیر کے سپرد کیا جن کا خاندان مکہ کے سرداری نظام میں اس منصب پر فائز تھا۔ اس کے علاوہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن خطاب کو اہل مکہ سے مذاکرات کے لیے اپنا سفیر مقرر کرنا چاہا تو انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ انہیں خدشہ ہے کہ اہل مکہ ان کی جان کے درپے ہیں اور وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں گے۔ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں کہا کہ وہ اس ذمہ داری کے لیے بہتر آدمی ثابت ہوں گے۔ پھر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عوام کے قانونی مشیر بنائے جانے کا معاملہ ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''سیدھے سادے معاملات میں ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے رہنمائی لے لیا کرو۔ وہ آپ کو بتائیں گے کہ اسلامی قانون کیا ہے۔'' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود زمزم کا انتظام و انصرام حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی کعبہ کے کلید بردار کو اس کے منصب پر برقرار رکھنے کی نوید دی۔

حکمران

انفرادی طور پر کوئی شخص بھی بہت زیادہ نہیں کر سکتا اس لیے گروپوں کی شکل میں دوستوں کے قریب رہنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایک مرکز کے گرد جمع ہونے کے رجحان کے پیش نظر خاندان، قبیلے، شہری ریاستیں، مملکتیں اور بڑی بڑی سلطنتیں وجود میں آئیں اور شاید اس کا کوئی اختتام بھی نہ ہو حتیٰ کہ پوری دنیا ایک عصائے شاہی کی تابع فرمان ہو جائے۔ بنی نوع انسان کی پوری سیاسی تاریخ میں ایک مرکزی اتھارٹی بنیادی اور ناگزیر تقاضا رہی ہے اور اسلام کو بھی اس حوالے سے کوئی استثنیٰ حاصل نہیں۔ قرآن اور حدیث میں بھی اس ضرورت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ فرمان خداوندی ہے ''اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اور ایک دوسرے سے جھگڑا نہ کرو کیونکہ اس طرح تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور صبر کرو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' (46/8) چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لافانی نہیں ہیں اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نامزد کردہ افراد اور خلفاء کو وہی مقام حاصل ہے اس بارے میں قرآن کا حکم قطعی طور پر واضح ہے ''اے مومنو! اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اور (ان کی بھی اطاعت کرو) جو تم میں صاحبان اختیار ہیں۔ پھر اگر کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے لوٹاؤ اللہ تعالیٰ کی طرف اور رسول کی طرف اگر تمہیں اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہے۔ یہ بہت بہتر ہے اور بہ اعتبار انجام کے بہت اچھا ہے۔'' (59/4)۔

اسلام میں حقوق اور ذمہ داریاں ہر شخص پر تقسیم ہیں اور دوسرے مذاہب کے مقابلے میں مسلمانوں کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں۔ معروف کتب احادیث مسلم، ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے کوئی برائی دیکھے تو اسے بزور بازو (بزور طاقت) روکنے کی کوشش کرے، اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کی کوشش کرے (برائی سے منع کرے) اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھے تو (کم از کم) دل میں اسے برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہوگا''۔ اس سے ملتی جلتی کیفیت ایک اور حدیث پاک میں بھی مذکور ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اگر تمہارا حاکم (رعایا سے) حسن سلوک کرتا ہے تو اسے اس کا اجر اللہ کے ہاں ملے گا اور تمہیں (اس پر) شکر گزار ہونا چاہیے لیکن اگر حاکم ظلم کرتا ہے (اور تمہارے پاس صورت حال سے چھٹکارے کا کوئی ذریعہ نہیں) تو تمہیں صبر سے کام لینا چاہیے اور ظالم کے گناہوں کا بوجھ اس کے اوپر لادا جائے گا'' بادشاہ اور حاکم کے ظلم کی کہانی بہت پرانی ہے قرآن نے ملکہ سبا (بلقیس) کی زبانی کہلوایا ہے ''یقیناً بادشاہ جب شہروں میں داخل (حملہ آور) ہوتے ہیں تو اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں اور وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل کرتے ہیں اور یہ بھی ایسا ہی کریں گے۔'' (34/27) بائبل کا اس حوالے سے سبق یہ ہے ''کہ پیغمبر سیموئیل نے کہا کہ بادشاہ عورتوں اور مردوں سے بیگار لے گا۔ جبری فوجی خدمت لے گا۔ حقیقی مالکوں سے زرخیز زمینیں چھین لے گا اور جائیدادوں کا دسواں حصہ ٹیکس کی صورت میں لے گا وغیرہ'' پھر (پیغمبر) سیموئیل نے لوگوں کو حکومت کرنے کے آداب سکھائے اور اسے ایک کتاب میں لکھ کر خداوند کو پیش کر دیا۔'' (I سیموئیل 8/11-18 اور 10/25)

اس حوالے سے اسلامی تعلیمات بہتر اور قابل قبول ہیں۔ اس میں رعایا پر اپنے حاکم کی اطاعت فرض ضرور کی گئی ہے لیکن حاکم پر رعایا سے انصاف پر بھی اتنا ہی زور دیا گیا ہے۔ انصاف کا حکم دینے والی متعدد آیات میں ایک یہ ہے ''اے ایمان والو! عدل و انصاف پر مضبوطی سے جم جانے والے اور اللہ کی خوشنودی کے لیے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ گو وہ خود تمہارے اپنے خلاف ہو یا اپنے ماں باپ کے یا رشتہ دار عزیزوں کے۔ وہ

شخص اگر امیر ہو تو اور اگر فقیر ہو تو دونوں کے ساتھ اللہ کو زیادہ تعلق ہے اس لیے تم خواہش نفس کے پیچھے پڑ کر انصاف نہ چھوڑ دینا اور اگر تم نے کج بیانی یا پہلو تہی کی تو جان لو کہ جو کچھ تم کرو گے اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔" (135/4)

اس حوالے سے ایک حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے جس پر پوری انسانیت فخر کر سکتی ہے اور اس کے راوی بڑے معتبر ہیں۔ "تاریخ بغداد" میں روایت ہے کہ عظیم محدث خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے باپ خلیفہ المہدی سے، انہوں نے اپنے باپ خلیفہ المنصور سے، انہوں نے اپنے باپ عکرمہ سے، انہوں نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، اور انہوں نے جریر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا کہ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا "قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے۔" (سید القوم خادمھم)

مشاورت

قرآن کریم نے امور عامہ کے بارے میں مشاورت کے واضح احکام دیئے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بھی یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اہم دنیاوی معاملات پر صحابہ کرامؓ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ مشورہ کس سے کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف انصار اور مہاجر اکابرین سے مشورہ کیا کرتے تھے بلکہ اگر کوئی مسئلہ اجتماع عام میں پیش کیا جاتا تھا تو ہر مسلمان کو اپنی رائے دینے کا حق حاصل تھا۔ جنگ حنین (ہوازن) کے بعد جب اس دوران ہاتھ آنے والے قیدی غلام بنا لئے گئے تھے اور اس دور کی روائت کے مطابق انہیں جنگ میں حصہ لینے والوں میں دوسرے مال غنیمت کے ہمراہ تقسیم کیا جا چکا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قیدیوں کو آزاد کرنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ قیدی ابھی سرکاری تحویل میں تھے تاہم جو تقسیم کر دیئے گئے تھے ان کے مالکوں سے اس بارے میں مشورہ کرنے کے لیے کچھ افراد کی ڈیوٹی لگائی گئی۔

جب تک معاشرہ خونی رشتوں کی بنیاد پر قائم قبیلوں پر مشتمل تھا تو قبیلے کا سردار ہی فطری اور بااختیار ترجمان سمجھا جاتا تھا تاہم یہ نظام وقت کے ساتھ شکست و ریخت کا شکار ہونے لگا اور اس کی جگہ نئے اتحاد اور ادارے وجود میں آنے لگے۔ اس حوالے سے ''تجاوزات'' کا آغاز ہجرت سے ہوا۔ مدینہ میں مہاجرین کی عددی طاقت کم تھی اور ان کا تعلق بھی مختلف قبائل سے تھا۔ ان میں بعض غیر عرب بھی تھے مثلاً بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ حبشی اور صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ رومی، خباب ابن الارت عراقی اور اسی طرح بعض دوسرے صحابہ کرامؓ جن کا تعلق سرزمین عرب سے نہیں تھا۔ تاہم شہری ریاست اور سوشل سکیورٹی کا نظام تشکیل دیتے وقت ان سب کو ایک قبیلہ یعنی مہاجرین کا فرد شمار کیا گیا جو ایک کثیر النسلی قبیلہ بن گیا جس میں نسل اور زبان کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ اسلام ایسے ہی نظام کا داعی ہے جو بہت جلد وجود میں آ گیا لیکن یہ محض آغاز تھا۔ جلد ہی ''معاقل'' (سوشل سکیورٹی) کے یونٹوں کی تشکیل پیشوں کی بنیاد پر ہونے لگی جیسا کہ ہماری قانون کی کتب (Law Books) بتاتی ہیں۔ اس حوالے سے میری یہ عاجزانہ تجویز ہے کہ نمائندوں کا انتخاب علاقہ نہیں بلکہ پیشوں کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ پارلیمنٹ میں ہر پیشہ کے بارے میں سوالات ہوتے ہیں اور جب تک ہر پیشے کے ماہر موجود نہ ہوں قانونی تقاضے پورے نہیں کیے جا سکتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے دوران بلاشبہ قانون سازی سربراہ ریاست کی حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں رہی مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء کے دور میں یہ روائت برقرار نہ رہی بلکہ اس کے برعکس ''غیر سرکاری'' فقیہہ اسلامی قوانین وضع اور ''نافذ'' کرتے رہے چاہے وہ سنی تھے، شیعہ تھے یا کوئی اور۔ اسلام میں نہ صرف نظام انصاف حکومت کا حصہ نہیں تھا بلکہ قانون سازی کا عمل بھی حکومتی عمل دخل اور اثر سے آزاد رہا۔ حکومتی فیصلے موقع کے سیاسی تقاضوں کے زیر اثر ہوتے ہیں اور کوئی شخص ان سے اختلاف نہیں کر سکتا مگر غیر سرکاری فقیہہ اپنی رائے آزادانہ دیتے ہیں جن سے کوئی بھی شخص اختلاف کر سکتا ہے اور اس کی نفی میں دلائل اور ثبوت پیش کر سکتا ہے۔ اس طرح عام لوگوں کا مفاد بھی یقینی ہو جاتا ہے اور اس میں قانون سازی بھی جلد

ہونے اور بہتر قانون وجود میں آنے کا امکان بھی ہوتا ہے۔ بلاشبہ متعدد مواقع پر اجتماع عام میں بھی مشورے کئے گئے مثلاً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بعض اہم فیصلے کرتے وقت عام لوگوں سے رائے لی (جیسا کہ مفتوحہ زمینوں کو دوسرے مال غنیمت میں شامل نہ کرنے کا معاملہ) تاہم معمول یہی تھا کہ ہر بڑا عالم اور فقیہہ اپنی رائے دینے اور قانون وضع کرنے میں آزاد تھا۔

ہم نشاندہی کر چکے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں ہم متناسب نمائندگی جیسی صورتحال سے روشناس ہوتے ہیں۔ ویٹو کے حق کے بارے میں سوال کا جواب آسان نہیں تاہم اگر سربراہ مملکت سے لے کر نیچے تک تمام سرکاری عمال کے اختیارات اور حدود کا تعین کر دیا جائے تو بہت سی مشکلات سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ چونکہ اسلام میں تمام مذاہب اور فرقوں کے پیروکاروں کو اپنے قوانین پر عمل کرنے کی آزادی دی گئی ہے قرآن کریم کی سورہ 5 آیت 47 میں ارشاد ربانی ہے "اور انجیل والوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ انجیل میں نازل فرمایا ہے اس کے مطابق حکم کریں اور جو (لوگ) اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ سے ہی حکم نہ کریں وہ (بدکار) فاسق ہیں") اس لیے امر واقعہ یہ ہے اور تاریخ اس کی گواہ ہے کہ غیر مسلم رعایا فرقہ وارانہ اختلافات کے باعث اپنے ہم مذہبوں کے اقتدار کی بحالی پر مسلمانوں کی حکومت کو ترجیح دیتی تھی۔ ڈچ مستشرق اور مورخ ڈی گوجے اس بات پر حیرت کا اظہار کرتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ادوار میں بازنطینی علاقوں کے لوگوں نے مسلمانوں کا نجات دہندہ کی حیثیت سے خیر مقدم کیا کیونکہ انہوں نے ہر مذہب اور فرقہ کے لوگوں کو اپنے مذہبی معاملات میں آزاد رکھا۔

اسلام کی تبلیغ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن اسلام کی تبلیغ تھا۔ سیاسی نظام کی تشکیل بذات خود مقصد نہیں بلکہ اسلام کو دشمنوں سے تحفظ فراہم کرنے کا ذریعہ تھا۔ جب ریاست کی

تشکیل عمل میں آ گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا بھر میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے ذرائع کی تلاش شروع کر دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کی بنیاد دوسروں کو قائل کر کے قبول اسلام پر آمادہ کرنے پر تھی اور کسی مرحلے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی پر اسلام کو ٹھونسا نہیں۔ اس ضمن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف ممالک کے حکمرانوں کو تبلیغی خطوط بھی لکھے اور انہیں اسلام کی دعوت دی۔ ان میں شاہ روم، شاہ فارس کے علاوہ حبشہ، مصر، اومان (عمان)، ساوا (عراق) کے حکمرانوں کو نامہ مبارک ارسال فرمائے۔ اس قسم کی سرکاری سرگرمیوں کی تفصیل میں جائے بغیر یہ حقیقت پوری طرح آشکار ہے کہ اسلام میں مسجد اور قلعہ (یا مذہب اور ریاست) کو ایک دوسرے سے الگ نہیں رکھا گیا کہ اسلام کا تو نظریہ ہی یہی ہے کہ ''اس دنیا میں بھی اچھائی اور دوسری دنیا میں بھی اچھائی (فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ)۔ سربراہ مملکت نماز کی امامت بھی کرواتا ہے، وہ فوج کا سالار بھی ہے اور عدالت کا قاضی بھی ہے اور ایک پہلو کی طرف اس کی توجہ سے دوسرا پہلو متاثر نہیں ہوتا کیونکہ ایک ہی شخص مذہبی اور سیاسی معاملات کا نگران ہے۔

نظام مالیات

قرآن کریم میں مال کو انسانیت کی بقا اور رزق کا وسیلہ بتایا گیا ہے (5/4) اور یہی صورتحال ریاست پر منطبق ہوتی ہے۔ شروع شروع میں خیرات وصدقات کے لیے سختی کی بجائے ترغیب پر اکتفا کی جاتی تھی۔ پہلی وحی کے بعد جس میں ''پڑھنے'' کا حکم دیا گیا اور جس میں ''قلم'' کو معاشرے کے سدھار کا ذمہ دار قرار دیا، اگلی ہی وحی میں (سورۃ 93) ضرورت مندوں اور یتیموں کے لیے خیرات وصدقات کا مطالبہ کیا گیا۔ بعد میں خیرات و صدقات کے ایک حصے کو فرض قرار دیدیا گیا جس کو حکومت وصول کر کے قانون کے مطابق خرچ کرنے کی پابند ہوگی۔ خیرات وصدقات کی درجہ بندی میں زکوٰۃ، صدقات اور ''حق'' ہیں۔ زکوٰۃ کا مطلب مال کو آلائشوں سے پاک کرنا، صدقات سے مراد اپنے مذہب کی

سچائی اور صداقت کے ثبوت کے لیے خرچ کرنا اور حق کہ جو غریبوں کا امیروں پر ہے کہ وہ اپنے مال سے حاجت مندوں پر خرچ کریں۔ قرآن میں ان اصطلاحات کے تذکرہ کے ساتھ آمدنی، شرح وغیرہ کی زیادہ تفصیلات نہیں دی گئیں۔ زرعی ٹیکس اور تجارتی ٹیکس وغیرہ کے محض اشارے دیئے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملات دانستہ طور پر لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیئے گئے ہیں کہ وہ وقت اور ضرورت کے مطابق اس بارے میں فیصلہ کر لیں۔ تاہم اخراجات کا تعین کر دیا گیا ہے اور انہیں صوابدید پر نہیں چھوڑا گیا۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے ''بے شک صدقات فقیروں (مسلمان حاجت مند) اور مسکینوں (غیر مسلم حاجت مند، (خلیفہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تشریح کے مطابق)، اس کے وصول کرنے والوں (جمع کرنے والے سرکاری اہلکاروں کی تنخواہیں وغیرہ) حمائت حاصل کرنے کے لیے (اسلام کے مفاد میں سیکرٹ سروسز وغیرہ) غلام آزاد کرانے یا (دشمن کے قبضے سے) قیدی چھڑانے، قرض داروں، اللہ کے راستے میں (جہاد، دفاعی نظام اور رفاہ عامہ کے کاموں کے لیے) اور (پھنس جانے والے) مسافروں کے لیے۔ یہ اللہ کی طرف سے فرض ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔'' (60/9)

اس ضمن میں بعض تفصیلات قابل ذکر ہیں۔ یہ کہ سربراہ ریاست کو زکوٰۃ جائز نہیں اس طرح نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلے کے تمام افراد اور بنو مطلب قبیلہ کے متعلقین بھی زکوٰۃ حاصل کرنے کے اہل نہیں۔ زکوٰۃ نہ صرف پیداوار پر واجب الادا ہے بلکہ بچت پر بھی۔ ذخیرہ اندوزی قابل سزا ہے۔ رقم کو ہمیشہ گردش میں رہنا چاہیے چونکہ پیداوار (زرعی) پر واجب الادا رقم اس کا دسواں حصہ ہے اس لیے زرعی ٹیکس کو عشر بھی کہا جاتا ہے۔ غیر مسلموں پر اس مد میں جو ٹیکس عائد ہوتا ہے وہ خراج کہلاتا ہے۔ مال غنیمت کا پانچواں حصہ سرکاری خزانہ میں جمع ہوتا ہے اور باقی مہم میں حصہ لینے والے فوجیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ غیر مستقل ذریعہ آمدنی ہے اسلیے اس کے وصول کرنے والوں کی تخصیص کر دی گئی ہے۔ یہاں تفصیل دینے کی گنجائش نہیں ہے۔ مقصد صرف یہ نشاندہی کرنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ریاست قائم کی اور چلائی وہ ٹیکس نظام سے مبرا نہیں تھی بلکہ اس نے تو ٹیکس کو اتنی اہمیت دی کہ اسے نماز،

روزہ اور حج کے بعد اسلام کا چوتھا رکن قرار دیا۔

دفاع

ریاست کے اہم ترین فرائض میں قومی دفاع کا نظام قائم کرنا بھی ہے۔ ابتدا میں تو یہ کام رضا کاروں کی ہی ذمہ داری تھی اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرض قرار دیا تھا اور اس کے بدلے میں اللہ کی طرف سے بے بہا انعامات کی نوید دی تھی اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رضا کارانہ لڑنے والوں کی کبھی کمی نہیں ہوئی لیکن بعد کے برسوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مستقل فوج کے قیام کی ضرورت محسوس کی۔ اس حوالے سے امام محمد الشیبانی اور امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے تذکرہ کیا ہے کہ صحت مند اور فوجی خدمات کے قابل لوگوں کو سرکاری خزانہ سے وظیفہ ملتا تھا جس کے عوض وہ بوقت طلب فوجی ڈیوٹی کے لیے حاضر ہونے کے پابند تھے۔ انکار کی صورت میں وہ وظیفہ کے نااہل قرار پاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زمانہ امن کی فوجی تربیت، ہتھیاروں، گھوڑوں اور باربرداری کے اونٹوں اور دوسرے جنگی سازوسامان کی فراہمی سے بڑی دلچسپی تھی (جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دفاعی تیاریوں کا حصہ تھا)۔ عورتیں بھی جنگی مہمات میں حصہ لیتیں۔ عام طور پر ان کی خدمات کا دائرہ زخمیوں کی خبر گیری، سپاہیوں کے لیے کھانے کی تیاری اور دوسرے سول معاملات تک محدود تھا تاہم ہنگامی صورتحال میں وہ باقاعدہ لڑائی میں بھی شرکت کرتیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں اس قسم کے متعدد واقعات پیش آئے۔

تعلیم

وحی کا آغاز ہی ”پڑھنے“ کے حکم سے ہوا۔ اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے

مسلمان مردوں اور عورتوں کو تعلیم دلانے پر قدرتی طور پر توجہ دی گئی۔ ابن اسحاق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں لکھا ہے کہ ''جب بھی قرآن کا کوئی حصہ وحی کی صورت میں نازل ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے مردوں کے اجتماع میں تلاوت فرماتے اور پھر الگ سے عورتوں کے اجتماع میں اس کی تلاوت کرتے۔'' اس طرح یعنی مردوں اور عورتوں کے لیے تعلیم کا یکساں نصاب تھا۔

ہجرت مدینہ کے فوری بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سب سے پہلا کام کیا وہ مسجد کی تعمیر تھا جس میں اصحاب صفہ قیام پذیر ہوتے تھے اور یہ اسلام کی پہلی اقامتی یونیورسٹی تھی۔ ہر مسجد مدرسہ بن گئی اور صرف مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں نو مساجد کی موجودگی کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ طبری کی یہ روائت بھی قابل ذکر ہے ''یمن کے لیے تعلیم کا ایک انسپکٹر جنرل بھیجا گیا جو ایک سے دوسرے ضلع تک مصروف سفر رہتا اور اس دوران نہ صرف تدریسی فرائض سرانجام دیتا بلکہ تعلیمی ادارے بھی قائم کرتا'' گنجائش نہ ہونے کے باعث ہم اس نظام کی تفصیلات میں نہیں جائیں گے۔

انتظامیہ

دارالحکومت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متعدد سیکرٹریوں کی مدد سے خود نظام و نسق کی نگرانی کرتے تھے۔ مثلاً خط و کتابت اور قرآن کو جو وحی کی شکل میں نازل ہو رہا تھا تحریری شکل میں محفوظ کرنے کے لیے سیکرٹری مقرر تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس ضمن میں اکابر صحابہؓ سے مشورہ کا اہتمام بھی فرماتے۔ صوبوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گورنر مقرر فرمائے جن کی سرگرمیوں اور کارکردگی کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نگرانی کرتے۔ شہروں کی آبادکاری کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ہدائت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شہر کی گلیاں اتنی کھلی رکھو کہ دو اونٹ اپنے ساز و سامان سمیت آسانی سے ایک دوسرے کے پاس سے گزر جائیں۔ بازاروں کو بڑی

اہمیت دی جاتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کا معائنہ فرماتے اور دھوکہ دہی کی روک تھام کرتے۔ بازار کے معائنے کے لیے انسپکٹر بھی مقرر تھے۔ ابن حجر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مسعود میں خاتون انسپکٹروں کی تعیناتی کا بھی ذکر کیا ہے۔ مال ذخیرہ کرنے اور کاروبار میں غلط بیانی کی سخت ممانعت تھی اور سزا بھی دی جاتی تھی۔ درآمدی سامان پر ڈیوٹی عائد کی جاتی تھی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے درآمدی سامان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کا عائد ٹیکس کم کر دیا تھا تاکہ بڑھتی ہوئی قیمتوں کو کم کیا جا سکے۔ غیر مسلم تاجروں پر مسلمانوں کی نسبت دوگنا درآمدی ٹیکس عائد تھا۔ اس امتیاز کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں پر بہت سی پابندیاں لاگو تھیں۔ اس کے علاوہ مسلمان اپنی بچتوں پر ٹیکس ادا کرتے تھے جس سے غیر مسلم مستثنیٰ تھے۔

عدلیہ (نظام انصاف)

عدلیہ کا قیام ریاست کی اہم ترین ذمہ داریوں میں شمار ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر جگہ قاضی مقرر کئے۔ ان میں سے ایک کے اظہار رائے نے اسلامی قانون کو متحجر ہونے سے بچا لیا۔ معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن جبل یمن کے لیے قاضی مقرر ہوئے۔ روانگی سے قبل رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''فیصلے کیسے کرو گے؟'' ''اللہ کی کتاب کے مطابق'' انہوں نے جواب دیا۔

''اور اگر وہاں وہ مسئلہ نہ ہوا؟''

''پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے رہنمائی حاصل کروں گا۔''

''اور اگر وہاں سے بھی کوئی مثال نہ ملی؟''

''پھر میں اپنی فہم کو استعمال کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھوں گا۔''

(بہتر فیصلہ کے لیے)

''تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے پیغمبر کو ایک ایسی چیز کا اختیار عطا کیا ہے جو اس کے لیے خوشی کا باعث ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی خلافت میں اپنے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نظام عدل کے بارے میں جو ہدایات دی تھیں انہیں دور حاضر کے ایک مسیحی ماہر قانون نے ''نا قابل یقین حد تک جدید دور سے ہم آہنگ'' قرار دیا۔

جانشینی اور خلافت

میری عاجزانہ ذاتی رائے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنہوں نے خود ایک ریاست قائم کی اور چلائی عمداً اپنی جانشینی پر کوئی وصیت یا فیصلہ نہیں دیا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فرمان اور عمل کو قیامت تک مسلمانوں کے لیے نا قابل تبدیل قانون کی حیثیت حاصل ہو جاتی۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاندان میں سے کسی کو اپنا جانشین نامزد کر دیتے تو وہ خاندانی حکومت کی مثال بن جاتی اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور نظام کی ہدایت فرما دیتے تو ناممکن تھا کہ مسلمان اسے تبدیل کر تے۔ فرض کریں اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاندانی بادشاہت اور یک ملکی (UNITARY) نظام کے حق میں فیصلہ فرماتے اور فرض کریں ایک ملک کا حکمران مسلمان ہونا چاہتا تو اسے اس مقصد کے لیے اپنا تخت وتاج چھوڑنا پڑتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہزاروں پیچیدگیاں جنم لیتیں۔ اس معاملے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکیمانہ خاموشی نے مسلمانوں کے لیے اپنے وقت اور حالات سے ہم آہنگ نظام حکومت اختیار کرنے کے دروازے کھول دیئے جو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی متصادم نہ ہو۔

نتیجہ

اسلام میں بادشاہت، جمہوریت یا مذہبی سمیت تمام معروف اور غیر معروف نظام ہائے حکومت جائز ہیں بشرطیکہ قرآن اور حدیث کے احکام کو دیانت دارانہ انداز میں جائز

اور نا جائز کو مدنظر رکھ کر بروئے عمل لایا جائے۔ حکمران کی شخصیت ہمیشہ اہم ہوتی ہے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور یزید دونوں کے ادوار میں آئین اور قانون ایک ہی تھا لیکن دونوں کے طرز حکمرانی میں فرق صاف ظاہر ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ کسی بھی شخص کے اچھے یا بُرے ہونے کو تجربہ کی روشنی میں ہی پرکھا جا سکتا ہے اور اکثر اس عمل میں بہت دیر ہو جاتی ہے۔ بخاری کی ایک حدیث میں فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے ''ہم کسی کو عہدہ نہیں دیتے جو اس کی خواہش کرے۔'' ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کی بھلائی چاہتا ہے تو انہیں اچھے حکمران اور اچھے وزیر دے دیتا ہے اور جب اس کے برعکس چاہے تو بُرے حکمران اور بُرے وزیر دے دیتا ہے۔''

اے اللہ تعالیٰ ہم کو صرف اس کام کی توفیق دے جس سے تو راضی ہے کیونکہ خدا خود فرماتا ہے ''انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔'' ہمیں اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ کوشش کرنی چاہیے۔ آخر پر ہمیں یہ کہنا ہے کہ جو کچھ خدا نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے وہ ہمیں بصد مسرت قبول ہے کیونکہ جو کچھ اللہ نے ہمارے لیے منتخب کیا ہے وہی اچھا ہے۔

V
اسلامی سلطنت کی تنظیم
(قرآن کے آئینے میں)

جزیرہ نمائے عرب اسلام سے پہلے کبھی ایک اقتدار کے تحت متحد نہیں ہو سکا تھا اور یہ ایک انوکھا اور عجیب وغریب واقعہ تھا کہ پورے ملک نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو متحدہ طور سے اپنا روحانی اور سیاسی سردار تسلیم کر لیا۔ جس ملک میں نراج کا دور دورہ ہو وہاں دس ہی سال کی کوشش میں ایک مرکزیت اور نظام قائم کر دینا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم الشان کارنامہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو آسمانی وحی کا تابع قرار دیتے تھے، جو وقتاً فوقتاً آتی تھی اور جس کا مجموعہ اب قرآن کے نام سے دنیا میں موجود و مشہور ہے۔ اگر کوئی شخص سیرۃ نبویہ کا قریب سے مطالعہ کرے، تو اسے ام المومنین حضرت عائشہؓ کے اس قول کی صحت کو باور کرنے میں ذرا بھی دشواری نہ ہو گی کہ قرآن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا آئینہ ہے۔ (کَانَ خلقه الْقرآنَ) اسی لیے یہ معلوم کرنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں مملکت کا تصور کیا ہے، بڑی آسانی کے ساتھ قرآن کو دیکھنے سے ممکن ہے۔

یہ چیز قابلِ ذکر ہے کہ قرآن مجید میں نہ صرف ازمنہ سابقہ کے پیغمبروں کے حالات بیان ہوئے ہیں، بلکہ ان کی سیرتوں کو جو قرآن میں ہیں اب بھی ماخذ تسلیم کیا گیا ہے، بجز اس کے کہ صراحت سے قرآن اُسے یا اس کے کسی جزو کو منسوخ قرار دے، دوسرے الفاظ میں انبیائے سابقہ کی سنت مسلمانوں پر اب بھی واجب التعمیل ہے بجز اس کے کہ اس کے کسی معین جزو کے نسخ کا کوئی حکم قرآن مجید میں یا رسولِ کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کے افعال واقوال میں صراحت سے ملتا ہو۔ ایک آیت ملاحظہ ہو:

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحُکۡمَ وَ النُّبُوَّۃَ ۚ الخ

یہی وہ لوگ ہیں جنکو ہم نے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی،
اگر کوئی لوگ اس کو نہ مانیں تو ہم یہ امانت ایسے لوگوں کے سپرد
کریں گے، جو اس سے انکار نہ کریں، یہی وہ لوگ (اس سے اوپر
کی آیتوں میں (18) پیغمبروں کے نام لیے گئے ہیں جن میں
نوح، ابراہیم، اسمٰعیل، ہارون، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام شامل ہیں
اور انہی کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔) ہیں، جن کی خدا نے ہدایت
کی ہے، اس لیے تو ان کی رہنمائی کی پیروی کر۔

(قرآن 6/ 89 تا 90 نیز دیکھیے 42/ 13)

امام بخاری اور ترمذی نے ایک حدیث روایت کی ہے کہ جب کبھی کسی معاملہ میں براہِ راست آسمانی وحی نہیں آتی، تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم عام عربی رواجات کے اہلِ کتاب کے طریقوں کی پیروی فرمایا کرتے تھے۔

یہ چیز سیاسی معاملات کی حد تک بھی اسی طرح صادق آسکتی ہے جس حد تک معاشی و معاشرتی معاملات میں۔

معاشرۂ انسانی کی تاریخ پر نظر ڈالیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ مملکت کا قیام بڑے عرصہ کے بعد ہو سکا۔ قرآن مجید میں واقعات کی جو ترتیب ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوئے جن کو خدا نے زمین پر نائب یا خلیفہ مقرر کیا۔ وہ نسل انسانی کے باپ تھے اور بزرگ خاندان ہونے میں ان کا کوئی حریف نہیں ہو سکتا تھا، ان کی وفات کے بعد کئی نسلوں تک انکی اولاد میں مختلف قسم کے اختلافات اور برائیاں کم یا زیادہ مقدار میں جاری رہیں، اسی لیے قرآن مجید کے مطابق پیغمبر بھیجے گئے، جو خدا اور عام انسانوں کے مابین واسطے کا کام دیتے تھے اور انسانوں کو یہ بتاتے تھے کہ ان کے خالق کی مشیت اور اسکا حکم کیا ہے اور نیکی کی ترغیب دیتے اور

بُرائی سے روکتے تھے۔ ان پیغمبروں نے خلوص کے ساتھ جو بے غرضانہ نصیحتیں کیں اور ان کی باتوں کو کچھ لوگوں نے مانا بھی تو اس جماعت کی حیثیت کسی مملکت کی قرار دینی مشکل ہے۔ بظاہر قدیم ترین زمانہ میں انبیاء علیہم السلام کی آمد کے باوجود سیاسی نظام اور اقتدار کی ضرورت نہیں پائی جاتی تھی۔ قرآن مجید میں کئی بار ہا ذکر ہے کہ ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کو سرفرازی عطا ہوئی، مگر ایک مملکت کو دوسری مملکت کی جگہ قائم کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ان قومی وحدتوں کے غیر سیاسی وجود کے باوجود ان لوگوں کی معاشی اور سماجی سرگرمیوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، لیکن ان چیزوں کا ذکر صرف اس طور سے ہوا ہے کہ لوگ ان کو خدا کی نعمتیں سمجھ کر یاد رکھیں اور خدا کی اطاعت کا فریضہ بجالائیں۔

بادشاہی کے ذکر کا آغاز قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے ملنے لگتا ہے، جب کہ ایک شخص اپنے ملک کے تمام لوگوں کی جان و مال پر اپنا اقتدار چلاتا ہوا نظر آتا ہے (دیکھیے قرآن مجید 2 / 258 نمرود کا قصہ)۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ سے ادارۂ مملکت میں زیادہ استحکام و ترقی نظر آتی ہے، چنانچہ ان کے زمانہ کے حالات میں (دیکھیے قرآن مجید 12 / 30) بادشاہوں اور وزیروں اور سرکاری قید خانوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ (سورۂ یوسف)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جو حالات قرآن مجید میں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے ان مقدس رہنما کی تمنا اور کوشش یہ تھی کہ ارضِ موعود میں ایک مملکت قائم کریں، مگر قوم نے نااہلی کے مظاہرے (عدمِ اطاعتِ احکامِ الٰہی) سے مایوسی کا سامان کر دیا، آخر ان کی قوم کو چالیس سال تک انتظار کرنے کی ضرورت پیش آئی، کہ ایک بالکل نئی نسل پیدا ہو، جس کی بچپن ہی سے ان کی نگرانی میں تعلیم و تربیت ہو اور پھر اس نئی نسل کی مدد سے وہ ارض موعود کو فتح کریں، گو اسی اثنا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وفات پائی اور ان کی چہل سالہ تربیتی اسکیم ان کے بعض فیض یافتوں نے مکمل کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جو فرعونِ مصر تھا، وہ قرآنی تذکرے کے مطابق ایک خاصا باقاعدہ حکمران تھا، جس کا ایک وزیر تھا اور جس کے مشورے کے لیے معمرین

اور اہل الرائے لوگوں کی ایک مجلس بھی پائی جاتی تھی، اس مجلس کے اجلاسوں کی جو روئداد قرآن مجید میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے اور عاجلانہ فیصلے نہیں کیا کرتی تھی، بلکہ اس کے مشورے مناسب اور قابلِ عمل ہی ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام سے ان کی جدت طرازیوں کے باعث کیا برتاؤ کرنا چاہیے؟ جب فرعون نے، یہ سوال پیش کیا، تو مجلس شوریٰ نے نرمی اور اعتدال کا مشورہ دیا تھا، اس زمانہ میں عوام الناس تک ایک حد تک سیاسی شعور رکھتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ (قرآن مجید **28/19**) جب ایک شخص نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی سخت گیری کے باعث ملامت کرنی چاہی تو اس نے یہ الفاظ کہے تھے کہ:

"ان ترید الا اَنْ تکُونَ جبّارًا فی الْارض الخ
تُو تو زمین میں ایک جبار بن جانا چاہتا ہے اور صلاح و فلاح کا
کام کرنے والوں میں سے نہیں ہونا چاہتا۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں مجلس دوگانہ یا مرکب بادشاہت کا بھی پتا چلتا ہے۔ (قرآن مجید **20/32** چنانچہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی کے متعلق خدا سے دعا کی تھی کہ وَاَشرِکہُ فیُ امْرِیُ (اس کو میرے کام میں شریک بنا) طالوت یعنی بادشاہ ساول کا قصہ قرآن مجید میں ایک خصوصی دلچسپی کا حامل ہے۔ بنی اسرائیل کو ان کے دشمن نے شکست دیکر ان کے گھروں سے جلاوطن کر دیا تھا۔ انتقام کی خواہش نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ اپنے پیغمبر سے یہ خواہش کریں کہ ان پر ایک بادشاہ نامزد کیا جائے جو اُن کو ساتھ لیکر دشمنوں سے لڑ سکے۔

اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الخ
یاد کرو جب موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا کہ ہم
پر ایک بادشاہ کو مامور کرتا کہ ہم اللہ کی راہ میں لڑ سکیں، اُس (نبی)
نے کہا اگر تم لڑنا فرض ہونے کے بعد لڑنے سے انکار کرو تو؟

انہوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے، کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں جب کہ ہمیں ہمارے گھروں اور ہمارے بچوں سے نکال باہر کر دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود جب لڑنا ان پر فرض کیا گیا تو انہوں نے روگردانی کی، بجز چند لوگوں کے، اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ان کے پیغمبر نے ان سے کہا: دیکھو اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے، انہوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارا بادشاہ بنے؟ ہم اس سے زیادہ بادشاہت کے مستحق ہیں کیونکہ وہ مالدار نہیں ہے۔ اس (نبی) نے کہا اللہ نے اسی کو تم پر فوقیت دی ہے اور علم اور جسم میں اس کو وافر حصہ دیا ہے۔ اللہ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے، دیتا ہے، اللہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اور ہر چیز کو جانتا ہے۔" (قرآن مجید 2/246 تا 247)

علاوہ اور اہمیتوں کے اس اقتباس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مال و دولت یا حسب و نسب نہیں بلکہ علم و جسم یعنی سیاست دانی (قرآنی اصطلاح میں علم کا مفہوم معرفتِ حق ہے) اور بہادری بادشاہت کی اولین ضرورتیں ہیں۔ اس اقتباس سے یہ اہم چیز بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں یہودیوں نے مذہب اور سیاست کو الگ چیزیں ہونا تسلیم کر لیا تھا اور نبی کے علاوہ بادشاہ کی ضرورت سمجھی گئی تھی۔ بادشاہ فرائضِ نبوت بجا نہیں لا سکتا تھا اور نہ نبی فرائض بادشاہت، البتہ یہ چیز قابلِ ذکر ہے کہ طالوت یعنی بادشاہ ساؤل کے فوری جانشین حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام دونوں بادشاہت اور نبوت ہر دو حیثیتوں کے حامل بنے، ان کا کچھ تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

حضرت داؤد علیہ السلام کا قرآنی تذکرہ بے حد اہم ہے کیونکہ اس میں فرائضِ بادشاہت کا (جن میں عدل گستری سب سے اہم ہے) ذکر کیا گیا ہے:

(الف) وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ الخ

اور داؤد نے جالوت کو قتل کیا، پھر خدا نے اس کو بادشاہت اور حکمت عطا کی۔ (قرآن مجید 2/251)

(ب) وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ الخ

ہم نے اسکی حکومت کو مضبوط بنا دیا اور اس کو حکمت اور فیصلہ کرنے والی زبان عطا کی۔ (قرآن مجید: 38/20)

(ج) يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ الخ

داؤد! بیشک ہم نے تجھ کو زمین پر ایک نائب مقرر کیا ہے، اس لیے لوگوں میں حق کے ساتھ فیصلے کیا کر اور خواہشات کی پیروی نہ کر ورنہ وہ تجھے خدا کی راہ سے بھٹکا دیں گے اور جو کوئی خدا کی راہ سے بھٹکے تو اس کا انجام برا ہوتا ہے، کیونکہ وہ قیامت کے حساب و کتاب کو بھول جاتا ہے۔ (قرآن مجید: 38/26)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے سلسلے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ''اور سلیمان داؤد کا وارث بنا (قرآن مجید 27/16)'' اگر چہ بیٹا اپنے باپ کا جانشین ہوا تھا لیکن اس قرآنی تذکرے کا منشاء یہ بالکل نہیں ہے کہ بیٹا بطور حق کے بادشاہ بنا ہو بلکہ یہ محض خدا کی عنایت تھی کہ باپ کی جگہ بیٹے کو بھی حکومت ملی اور اقتدار کا اصلی سرچشمہ خدا ہی کی مشیت ہے۔

حکمرانی کے کل پرزوں کی حرکت کا سب سے دلچسپ منظر قرآن مجید میں ملکہ سبا کے تذکرہ میں ملتا ہے، چنانچہ:

قَالَتْ يٰاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْ اَمْرِيْ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ

''اُس (ملکہ) نے کہا اے سردارو مجھے میرے اس معاملہ میں مشورہ دو میں تمہاری موجودگی کے بغیر کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرتی،

انہوں نے کہا ہم بڑے طاقتور اور بہادر لوگ ہیں، حکم دینا تیرا کام ہے، اس لیے تو سوچ کر فیصلہ کر، اُس (ملکہ) نے کہا جب کبھی بادشاہ کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں، تو اُسے تباہ کر دیتے ہیں اور وہاں کے معززین کو ذلیل بنا دیتے ہیں اور وہ ایسا ہی کریں گے، البتہ میں اُن (حضرت سلیمان کے ملک والوں) کو ایک تحفہ بھیجوں گی اور دیکھونگی کہ سفیر کیا واپس لاتے ہیں۔ چنانچہ جب سفیر سلیمان کے پاس پہنچے تو انہوں نے فرمایا کہ تم مجھے مال کے ذریعہ سے کچھ مدد دینی چاہتے ہو، جب کہ وہ چیز جو خدا نے مجھے دے رکھی ہے، وہ اس سے کہیں بہتر ہے، جو اس نے تمہیں دی ہے۔ تمہیں تو اپنے تحفے ہی پر ناز ہے، ان کے پاس واپس جاؤ، ہم بیشک ان کے پاس ایسی فوجیں لیکر آئیں گے جن کا وہ مقابلہ نہیں کرسکیں گے اور ہم ان کو وہاں سے ذلیل کر کے نکال دیں گے اور وہ پست ہو جائیں گے۔ (قرآن مجید: 27/ 32 تا 37)

ہر زمانہ میں اس امر کی ضرورت تسلیم کیجاتی رہی ہے، کہ ملت کی رہنمائی کے لیے ایک قوانین کا مجموعہ بھی موجود ہو۔ قرآن مجید میں اکثر اس کا ذکر آیا ہے کہ پیغمبروں کو کتابیں یا صحیفے دیے گئے۔ کتاب کے لفظی معنی حکم دینے کے بھی آتے ہیں اور صحیفہ سے مراد دستور العمل ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں خاص طور سے اس کا ذکر ہوا ہے کہ جونہی وہ فرعون کی سرزمین سے نکل کر باہر آ گئے تو خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احکام لکھی ہوئی تختیاں (الواح) عطا کیں، جن کی تعمیل بنی اسرائیل پر فرض قرار دی گئی۔

ظالم بادشاہوں کے ظالمانہ اور نامناسب افعال کی قرآن مجید میں بار ہا بُرائی کی گئی ہے (دیکھیے قرآن مجید 18 / 80، 28 / 4 وغیرہ)۔ ایک چیز جو قرآنی تذکروں میں خاص طور سے قابلِ ذکر معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ مملکت سے زیادہ حکمرانِ مملکت کو

نمایاں کیا گیا ہے، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مملکت کا ذکر محض ضمناً آیا ہے اور سیاسی وحدت میں بادشاہ کا ذکر ہی سب سے نمایاں ہے، کیونکہ قدیم زمانوں میں یہی صورت حال تھی۔

اسلامی مملکت:

اب تک ہم نے اپنی تحقیقات کو زمانۂ قدیم کی مملکت تک محدود رکھا تھا، اس کے معنی یہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اسلامی مملکت قائم کی تھی، اس کے لیے کوئی خصوصی احکام قرآن مجید میں نہیں دیے گئے، ہمارے تذکرہ کا منشا یہ تھا کہ چونکہ انبیاے سلف کی سنت بھی مسلمانوں کے لیے واجب التعمیل قرار دی گئی ہے، اس لیے ان کے زمانہ کے احکام کا تذکرہ نہ صرف اسلامی مملکتی تصور کے لیے ایک پس منظر کا کام دیتا ہے بلکہ واقعتہً وہ اسلامی قانون سیاسی و انتظامی کا جزو بن جاتے ہیں۔ وہ احکام جو قرآن مجید میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر دیے گئے ہیں، ان کا موضوع وار تذکرہ کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلی چیز یہ ہے، کہ اقتدارِ اعلیٰ کے ربانی ماخذ کو کہیں بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے اور قیامت کے حساب و کتاب پر بار بار زور دیا گیا ہے تا کہ بادشاہ میں کسی دنیاوی ذمہ داری کے نہ ہونے کے باعث استبداد نہ پیدا ہو جائے، اگرچہ قرآن مجید میں علاقے یا زمین کا ذکر بعض وقت حکمرانی کے ساتھ آیا ہے، لیکن وہ بڑی حد تک ضمنی ہے، بنیادی نہیں مثلاً:

(الف) قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ الخ

کہہ اے خدا ملک کے مالک! تو ہی جس کو چاہتا ہے، ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک واپس لے لیتا ہے، جس کو چاہتا ہے تو عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے تو ہی ذلیل کرتا ہے، بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے، تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

(قرآن مجید: 3/26)

(ب) هُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ الخ

وہی ہے جس نے تم کو زمین میں نائب مقرر کیا اور تم میں سے چند
کو دوسروں پر رتبے میں فوقیت دی تاکہ تمہیں اس چیز کے ذریعہ
سے آزمائے، جو اس نے تمہیں دی ہے۔ (ایضاً 6/165)

(ج) وَلَقَدْ مَکَّنّٰکُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَکُمْ فِیْھَا مَعَایِشَ قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ

اور ہم نے تم کو زمین میں اقتدار عطا کیا اور تمہارے لیے وہاں
روزی مہیا کی بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔ (ایضاً 7/10)

جامعۂ روما کے پروفیسر نالینو کو یہ تسلیم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں معلوم ہوتی کہ اسلامی حکمران کی تخت نشینی کے وقت جو بیعت لی جاتی ہے، وہ ایک طرح سے معاہدۂ معاشرتی کہلا سکتا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:

"کسی شخص کو خلافت کا رتبہ عطا کرنا فقہا کے نزدیک ایک معاہدہ
ہوتا ہے، جس کا ایک فریق وہ شخص ہوتا ہے جو اس عہدے کو قبول
کرے اور دوسرا فریق جماعت اسلام ہوتی ہے، یہ معاہدہ اس
وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ بیعت یعنی اظہارِ وفاداری
امت کے اصحابِ حل و عقد کی طرف سے نہ عمل میں آ جائے"
(فرانسیسی رسالہ موسومہ خلافت کی عام نوعیت اور سلاطینِ عثمانیہ
کے دعوائے خلافت پر تبصرہ، مطبوعہ روما، ص: 11)

لفظ بیعت کے معنی خود ایک معاہدہ کے ہوتے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وفاداری اور اطاعت کی ایک طرف سے پیشکش کی جائے اور دوسرے فریق کی طرف سے اُسے قبول کیا جائے۔ (دیکھیے قرآن مجید 48/17، 60/12) دوسرے الفاظ میں حکمران کا اقتدار چاہے مشیتِ عامہ سے پیدا نہ ہوتا ہو لیکن اسی پر مبنی ہوتا اور اسی کا محتاج ضرور رہتا ہے۔

اگرچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مسلمانوں میں یہ چیز جزوِ عقیدہ ہے

کہ پیغمبر معصوم ہوتے ہیں اور اگرچہ خلفاء پیغمبروں کے سیاسی جانشین سمجھے گئے لیکن معصومیت کا یہ اعزاز ان کے لیے کبھی تسلیم نہیں کیا گیا، یہی وجہ ہے کہ بعض دیگر قوموں میں ''بادشاہ کوئی غلطی نہیں کرسکتا'' کا جو سیاسی نظریہ یا کلیہ پایا جاتا ہے، وہ مسلمانوں میں کبھی جگہ نہ پاسکا، اسکے برخلاف مسلمانوں کو اسی پر ناز ہے کہ نہ صرف عام حکمران بلکہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھی حقوق العباد کے معاملے میں انہی عام قوانین کے پابند ہیں جن کے عام مسلمان اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھی خود اپنی ذات کے خلاف مقدمات سنے اور منصفانہ فیصلہ کیا (سیرۃ ابن ہشام ص 444، کامل ابن الاثیر ج: 2 ص: 141 نیز سیرۃ شامی میں آٹھ دس ایسے واقعے درج ہیں)، پیغمبروں کی معصومیت کا منشاء اسلامی علم کلام میں صرف یہ لیا جاتا ہے کہ وحی کی تبلیغ اور خدا کے احکام پہنچانے میں ان سے کوئی غلطی یا سہو سرزد نہیں ہوسکتا، اس کے علاوہ دیگر معاملات میں پیغمبر کی حیثیت بھی ایک انسان ہی کی ہوتی ہے اور احادیث میں متعدد مرتبہ بیان ہوا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیاوی معاملات میں میں بھی تمہارے ہی طرح ایک انسان ہوں، سیاسی حیثیت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جماعت اسلام کے ایک فرد تھے اور ان قوانین کے جن کو آپ نافذ کرتے تھے، خود بھی پوری طرح پابند تھے۔

غرض جملہ مخلوقات کی طرح کرۂ ارض اور انسانی بستی کا بھی اصل مالک اور بادشاہ خدا ہی کی ذات ہے اور وہی صلاحیتوں کو دیکھ کر کسی انسان کو اپنی نیابت سے سرفراز کرتا ہے اور پھر دیکھتا ہے کہ وہ عمل کیسا کرتا ہے۔(انّ الارض یَرثھا عبادِیَ الصّالِحُونَ انّی جاعِلٌ فی الارضِ خَلِیفۃ لِیَنظرَ کیفَ تعملُونَ انّ الارض لِلّٰہ یُورثھا منْ یشآء مِنْ عبادِہٖ وغیرہ) خدا کا خلیفہ برحق تو نبی ہوتا ہے جس کا براہ راست وحی سے تقرر ہوتا ہے اور وحی ہی سے اسکی رہنمائی ہوتی ہے، اس کے باوجود بھی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اطاعت اور پیروی کی بیعت لیتے رہے، نبی کے دنیا سے پردہ فرمانے پر احکامِ شریعت سے ناواقفوں کو واقف کرانے کی حد تک حدیث شریف میں ہے کہ العُلمَآء ورثۃ الانبیاء (معارف: سنداً یہ حدیث ثابت نہیں) لیکن سلطنت رانی اور سیاست مدن کے لیے ماوردی، ابنِ خلدون وغیرہ کے

الفاظ میں ''اصحاب حل وعقد'' کسی کا انتخاب کرتے ہیں اور یہ انتخاب بمصداق حدیث شریف یَدُ اللّٰہ علی الجَماعة منشاء ربانی کا اظہار اور باعثِ خیر وبرکت ہوتا ہے اور یہی اصحاب حل وعقد انتخاب اور بیعت کے بعد بھی حکمرانی میں مرجع کا کام دیتے ہیں اور ضرورت ہو تو اسے معزول بھی کر سکتے ہیں (بدائع الصنائع للکاسانی ج:7 ص:16)، حکمران کے حقِ اجتہاد کے حدود، مصالح ملکی اور نظم ونسق میں شوریٰ کا موقف، اصحابِ حل وعقد کی دستوری حیثیت، وغیرہ پر تفصیل سے بحث یہاں ممکن نہ ہو گی البتہ اس سوال کا جواب شاید ضروری ہے کہ اصل دنیاوی اقتدار کے استعمال کا حق کس کو حاصل ہوتا ہے، اس کا جواب حضرت امام اعظمؒ کے الفاظ میں:

انّ نواحی دارالاسلام	اسلامی سرزمین کے جملہ حصے اسلامی
تحتِ ید إمام المسلمین	بادشاہ کے اقتدار میں ہوتے ہیں اور
ویده یَد جماعة المسلمین۔	اسکا اقتدار مسلمانوں کی جماعت کا
(مبسوط سرخسی ج۱۰ص۹۳)	ہی اقتدار ہوتا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے دونوں شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد شیبانی نے مزید وضاحت سے کہا ہے کہ کسی ملک کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا امتیاز یہ ہے کہ وہاں غلبہ اور محافظ قوت کس قوم کو حاصل ہے، تعداد سے بحث نہیں ''لَهُما الدار انّما تُنسب إلى اهلِها الثبوتِ يَد هِم القاهرة عليها وقيام وَلا يتهم الخافظة فيُها (محيط رضي الدّين سرخسى مخطوطه استانبول، ورق نمبر 605 ب) اور حنفی علماء متفق ہیں، کہ اسلامی مملکت کا انتظام امام پوری امت مسلمہ کے نائب کے طور پر کرتا ہے چنانچہ شارح شیبانیؒ کے الفاظ میں الامام بمنزلة جَماعة مِنَ المُسْلمِيْنَ فى استيفاء هذا الحق'' (مبسوط سرخسی ج 9 ص 204) یعنی اس حق کے نفاذ میں امام کی حیثیت امت مسلمہ کے قائم مقام کی ہوتی ہے۔

بہر حال یہ اسلامی تصورِ اقتدار اعلیٰ ہے کہ مقتدر اعلیٰ خداوند خلاق کی ذاتِ کبریائی ہے اور حکمرانی شریعت کو حاصل ہوتی ہے۔ اور ''خليفة اللّٰه فى الارض''

یا شریعت کے نفاذ کے افسر کا انتخاب بھی خدا ہی کرتا ہے اور اس بارے میں خدا کی مشیت کا اظہار ''یَدُ اللّٰہِ علی الجماعۃ'' اور ''لَا یجتمع اُمّتی علی الضلالۃ'' وغیرہ احادیث شریفہ کے بمصداق اور عہدِ خلافتِ راشدہ کے نظائر کے مطابق اصحابِ حل وعقد کی بیعت کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔

دین ودنیا کا ملاپ:

قدیم زمانوں میں جب انسانی تمدن نے زیادہ ترقی نہ کی تھی اور تقسیم کار کی اتنی زیادہ ضرورت پیش نہ آئی تھی، کسی ملک میں مرکزی حکومت کے اختیارات یا تو عدل گستری کے متعلق ہوتے تھے (جس میں دشمن سے جنگ بھی شامل ہے اور فقہ کی کتابوں میں باب الجہاد کا ذکر ''حدود'' یعنی سزاؤں کے سلسلہ ہی میں ملتا ہے) یا قومی معبود کی پرستش وعبادت کے متعلق۔ دیگر سلطنتی نظم ونسق کے مسائل اٹھتے ہی نہ تھے بلکہ وہ عوام کے انفرادی معاملات سمجھے جاتے تھے اور عبادت ہی نہیں عدل گستری اور جنگ بھی مذہبی مراسم کے تابع تھی۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ کشوری اور مذہبی فرائض میں دوری پیدا ہوتی جاتی تھی۔ چنانچہ رومیوں نے جُس (Gus یا دنیاوی قانون) کو ہمہ گیر فاس (Feas یا مذہبی قانون) سے ایک الگ چیز کے طور پر ایجاد کیا۔ یہودیوں نے

قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ

(قرآن 246:2)

اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر جس کے ساتھ ہم خدا کی راہ میں جنگ کر سکیں۔

اور نبوت وبادشاہت یا مذہب وسیاست کو جدا کر دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف بھی یہ قول انجیل میں منسوب ملتا ہے کہ قیصر کی چیزیں قیصر کو دیدو اور کلیسا کی کلیسا کو۔ بدھ متیوں اور ہندوؤں کے ہاں بھی ترکِ دنیا ہی انسانیت کا کمال قرار پایا۔

غرض قدیم اہل مذہب نے دنیائے ناپائدار کو دل لگانے کے قابل چیز نہ سمجھا لیکن اس میں دو بنیادی مسائل نظر انداز ہو کر خامی پیدا ہوگئی، ایک تو گنتی کے چند فرشتہ

صفت انسانوں کے سوا باقی جو لاکھوں کروڑوں عامۃ الناس تھے، ان کے معاملات مادیت پسندانہ ہو گئے اور دوسرے سیاست کی اخلاقی بنیاد نہ رہی اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ سابقہ تمام مذاہب اکائیوں یا دہائیوں میں ختم ہو جانے والے فرشتہ صفت انسانوں کے لیے ہوتے تھے اور اسلام ناز کر سکتا ہے کہ وہ اُمیّوں اور اوسط درجہ انسانوں کے لیے ایک قابلِ عمل دستور لایا، یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں ایسوں ہی کی بہت بڑی اکثریت ہوتی ہے، انسان نما فرشتے اور انسان نما شیطان دونوں کی تعداد ہمیشہ بہت محدود ہی ہوتی ہے۔

مذہب اور سیاست دو بالکل الگ چیزیں ہیں۔ مذہب خدا اور بندے کے تعلقات کا نام ہے اور سیاست بندے اور بندے کے معاملات کا۔ ان دونوں کو ایک کہنے والا گویا ہاتھ اور پاؤں کو ایک کہتا ہے لیکن جس طرح ایک زندہ اور تندرست انسان میں ہاتھ اور پاؤں دونوں ہی ایک مشترکہ اور مرکزی قوت مثلاً عقل یا ارادے کے تابع ہوتے ہیں بالکل اسی طرح دین اسلام نے مذہب اور سیاست کو ایک مشترکہ دستور العمل کے تابع کر دیا جو قرآن یا ربانی کلام تھا اور دونوں ہی کی رہنمائی کے لیے احکام کا ماخذ ایک ہی قرار دیکر سیاست میں اخلاقی اساس اور اخلاق میں حقیقت پسندی باقی رکھی۔ کوئی شخص ہاتھوں کے بل تھوڑی دُور ضرور چل سکتا ہے اور پاؤں سے بُرا بھلا کچھ لکھ بھی ضرور سکتا ہے، اسی طرح عبادت کو سیاست اور سیاست کو عبادت بنا کر انسان چند روز گزار ضرور سکتا ہے لیکن یہ غیر فطری عمل نہ تو سہولت بخش ہوگا اور نہ مفید۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے ایک بزرگ سیرت نگار نبوت کے الفاظ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لیکر آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف آسمانی بادشاہت کی خوشخبری نہیں سنائی بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی تا کہ دنیا میں خدا کی بندگی بے خوف وخطر کیجا سکے اور خدا کی بادشاہی دنیا میں قائم ہو:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ الخ

''خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے یہ وعدہ کیا کہ وہ ان کو زمین میں حاکم بنائیگا (جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے) اور اُن کے لیے ان کے اس دین کو جو اُس نے اُن کے واسطے پسند کیا ہے جما دیگا''۔ (قرآن 24:55)

قرآن نے سب سے اچھی دعا انسانوں کے لیے یہ بتائی ہے:

رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ

''اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھلائی دے اور ہم کو آگ کے عذاب سے (دوزخ) سے بچا۔ (قرآن 2:201)

اور ایک جگہ فرمایا:

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ
وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ

''اور جنہوں نے نیک کام کیے ان کے لیے اس دنیا میں بھلائی ہے اور آخرت کا گھر سب سے اچھا ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیسا اچھا ہے! (قرآن 16:30)

جن لوگوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی ان کو بشارت ہے:

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ
يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ

''تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا اور اللہ نیکی کرنے والوں کو چاہتا ہے۔ (قرآن 3:148)

دنیا کا ثواب فتح ونصرت، ناموری وعزت، مال و دولت اور حکومت وسلطنت ہے جنہوں نے خدا کی راہ میں پنا گھر بار چھوڑا اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی، ان کو دونوں جہان کی نعمتیں بخشیں:

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا الخ

''اور جنہوں نے (ہمارے لیے) ستائے جانے کے بعد گھر چھوڑا
ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور بیشک آخرت کا اجر سب
سے بڑا ہے۔
(قرآن 41:16)

(اور اولیاء و اتقیاء یعنی فرشتہ صفت مسلمانوں کو ترکِ دنیا کی ہدایت نہ کی بلکہ دنیاداری اور دین داری دونوں کے ملاپ کا حکم دیا):

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ الخ

''وہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں جما دیں تو وہ نماز
کھڑی کریں اور زکوٰۃ دیں اور اچھے کاموں کو کہیں اور بُرے
کاموں سے روکیں اور ہر کام کا انجام خدا کے ہاتھ میں ہے۔
(قرآن 41:22)

ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں خدا کے قانون کے اجراء کی طاقت ہونی چاہیے اور یہ اشارہ بھی کہ دین کا امتزاج یا ملاپ ہی انسان کو انسان بناتا ہے اور ''احسن تقویم'' کا مظاہرہ ہوسکتا ہے ورنہ وہ یا تو فرشتہ ہو جائے گا یا شیطان اور ان دونوں اصناف سے جدا ایک خاص مخلوق یعنی انسان کی تخلیق کا مقصد فوت ہو جائیگا۔

ایسی آیتیں قرآن مجید میں بکثرت ملتی ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا نے اپنی ہر مخلوق انسان کی خدمت یا استفادے کے لیے پیدا کی ہے اور انسان اپنے خالق کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے مگر اس کی تفصیل یہاں طول بحث سمجھی جائیگی۔

بیعت:

حکمران کی اطاعت کو جیسی کچھ اہمیت حاصل ہے، ظاہر ہے، قرآن مجید میں بھی اس پر کچھ کم زور نہیں دیا گیا، مثلاً

(الف) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ الخ

''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے افسرانِ حکومت ہوں، اگر تم میں کسی معاملہ میں آپس میں جھگڑا ہو تو اُسے اللہ اور رسول سے رجوع کرو، اگر تمہیں خدا اور یومِ آخرت پر سچا ایمان ہو، یہی بہتر اور مآلِ کار اچھا طریقہ ہے۔
(قرآن 59:4)

(ب) وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۚ الخ

''اگر امن یا خوف کی ان کو کوئی خبر ملتی ہے، تو اسے مشہور کر دیتے ہیں، بہتر ہوتا کہ وہ اسکی اطلاع رسول کو اور اپنے افسروں کو دیتے تو سمجھدار لوگ اس کو سمجھ جاتے۔ (قرآن 83:4)

یہ تو افسروں کی اطاعت کا ذکر تھا۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی اطاعت پر تو اس سے بھی زیادہ مواقع پر زور دیا گیا ہے۔ کہیں صرف حکم ہے تو کہیں اس کے فوائد بتا کر ترغیب دی گئی ہے۔ رسول کی اطاعت اور پیروی کے ان احکام پر یہ ناگزیر نتیجہ تھا کہ بعد کے زمانہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول اور فعل کا تذکرہ محفوظ کرنے کی اتنی عظیم الشان کوششیں اہلِ علم کی جانب سے عمل میں لائی گئیں۔ ایسی بعض آیات حسب ذیل ہیں:

(الف) وَ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ

جو کچھ رسول تمہیں دیں اُسے لے لو اور جس سے منع کریں اس سے رُک جاؤ، (قرآن 7:59)

(ب) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

''بیشک اللہ کے رسول میں تمہارے لیے ایک اُسوہ حسنہ پایا جاتا ہے۔ (قرآن 21:33)

(ج) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ۝ الخ

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور جب وہ کچھ کہے تو سن کر روگردانی نہ کرو..........اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں تاکہ تم کمزور نہ پڑ جاؤ اور تمہاری ہوا نہ اکھڑ جائے (ایک بحری محاورہ ہے، بادبانوں سے ہوا نکل جائے تو ملاح بے بس ہو جاتا ہے، اس محاورے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ قدیم عربوں کو سمندر سے کتنا لگاؤ تھا) اسکے برخلاف صبر سے کام لو، اللہ صبر سے کام لینے والوں کیساتھ ہوتا ہے۔

(قرآن مجید 8:21و46)

(د) وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۝

''وہ (یعنی رسولِ خدا) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا، بلکہ وہ وحی ہی ہوتی ہے۔

(قرآن مجید 53:3-4)

آرنلڈ نے اپنی کتاب خلافت میں بالکل ٹھیک رائے ظاہر کی ہے کہ اس طرح رعیّت کے فریضۂ اطاعت پر زور دیا گیا، مگر اس کے ساتھ ہی حکمران کے لازمی فرائض کا اتنا ذکر نہیں ہوا، اس سے اسلامی حکمران جابر اور استبداد پسند نہیں بن گیا کیونکہ حشر و نشر اور حساب و کتاب کا عقیدہ نیز حکمران کا بھی قانونِ اسلامی کے ماتحت ہونا اس پر گرفت رکھنے کے لیے کافی ثابت ہوئے۔ اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ حکمران کے فرائض پر قرآن مجید نے زور نہ دیا ہو۔

(الف) فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ الخ

اس کے لیے بلا اور (اے محمد) استقامت سے رہ جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر بلکہ کہہ: میں ایمان

لاتا ہوں ہر اُس کتاب پر جو اللہ نے اتاری ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تم میں انصاف کرتا رہوں، اللہ ہمارا اور تمہارا آقا ہے، ہم کو ہمارے کام اور تم کو تمہارے کام، ہم میں اور تم میں کوئی حجت نہیں، اللہ ہمیں یکجا کرے گا اور ہمیں اسی کی طرف جانا ہے۔

(قرآن مجید 15:42)

(ب) فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

تب ہم یقیناً ان لوگوں سے دریافت کریں گے جن کے پاس ہمارا پیغمبر بھیجا گیا تھا اور ہم پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے۔

(قرآن مجید 6:7)

متعدد آیتوں میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ اجتماعی اور حکومتی مفاد کو انفرادی مفاد پر ترجیح دی جائے۔ مثلاً قرآن مجید (8:27 تا 28 و 9:24)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ الخ

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے خیانت نہ کرو اور نہ جان بوجھ کر اپنی باہمی اماتوں میں خیانت کرو۔

واعلموا انما اموالکم واولادکم فتنۃ، الخ

اور یہ جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایک آزمائش ہے اور خدا ہی کے پاس اجرِ عظیم پایا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا آیتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ذاتی مفاد کے لیے یا بیوی بچوں کی خاطر بھی ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو نامناسب ہو اور عالمِ آخرت کے حساب و کتاب کے لیے اپنے ہر فعل میں اس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

ضمناً اس چیز کی طرف بھی اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ حُبِ ملی اسلام میں ایک نیم مذہبی نیم سیاسی وحدت کے تصور پر مبنی ہے، جغرافی یا لسانی یا نسلی وحدت سے اُسے کوئی سروکار نہیں، چنانچہ:

(الف) يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا الخ

اے انسانو! ہم نے تم کو مرد اور عورت سے بنایا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا، تاکہ تم پہچانے جا سکو، لیکن اصل میں تم میں سے سب سے زیادہ بزرگ خدا کے پاس وہی ہوتا ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو، علم اور خبر خدا ہی کو حاصل ہوتی ہے۔

(قرآن مجید 13:49)

(ب) کُلّ مؤمنٍ اخوۃٌ

ایمان والے سب آپس میں بھائی ہیں۔ (قرآن مجید ۴۹:۲)

(ج) وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ الخ

اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور تفرقہ نہ کرو اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم آپس میں دشمن تھے اور (ایمان لانے کے باعث) اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور اس کی عنایت سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم تو آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے اور اسی نے تم کو بچایا۔ اس طرح اللہ اپنی آیتیں تم کو بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پا سکو اور تم میں سے ایک ایسی قوم پیدا ہو جو بھلائی کی طرف بلائے، اچھی بات کا حکم دے اور بُری بات سے روکے۔ ایسے ہی لوگ کامیاب ہونگے۔

(قرآن مجید 102:3)

یہ بیان کرنے کی شاید ہی کچھ ضرورت ہو کہ ایمان اور عملِ صالح کی فوقیت کے سوا اسلام حسب ونسب کی کسی برتری کو قطعاً تسلیم نہیں کرتا، انبیاء کی اولاد تک ''عمل غیرِ صالح (قرآن مجید 46:11)'' کے باعث عذاب میں گرفتار ہوئی۔

عدل گستری:

یہ حکمران کا اولین فریضہ ہے کہ اُسے ناطرفدار ہونا چاہیے اور انصاف کے ساتھ حسب موقع وضرورت رحم بھی کرنا چاہیے، (دیکھیے قرآن مجید 16:•90، 4:58و 135، 5:8، 16:40)۔

غیر مسلم ذمی رعایا کو عدالتی خود مختاری دینے کا قرآن مجید میں حکم ہے جہاں ان کے ساتھ ان کے شخصی قوانین کے مطابق فیصلے انجام پائیں گے، اگر غیر مسلم رعایا اسلامی عدالت میں اپنی مرضی سے مقدمہ یا مرافعہ پیش کرے تو اس کے ساتھ بھی انصاف کیا جانا چاہیے (دیکھیے قرآن مجید 5:42 تا 50) اس بارے میں مزید تفصیل ایک علیحدہ مضمون کی متقاضی ہے ("عدل گستری ابتدائے اسلام میں" کے عنوان سے ایک مضمون مجلّہ عثمانیہ حیدرآباد مارچ 1938ء میں چھپا ہے جس کے حوالے فرانسیسی مولفین سے بھی دیئے ہیں) البتہ اتنا اور اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ قیامت کی جزائے اعمال، حساب وکتاب، چشم دید گواہ، تحریری شہادت، کراماً کاتبین کی ڈائری وغیرہ کی جو تفصیل قرآن میں آئی ہے وہ عہدِ نبویؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے مروجہ امور ہوں گے جن کے ذریعہ سے عالمِ آخرت کا خاکہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

شورائیت:

قرآن مجید میں حکم ہے کہ حکمران اپنے فیصلے مشورہ لیکر کیا کرے، چنانچہ:

(الف) وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ الخ

اور اُن سے معاملات میں مشورہ کر پھر جب تو عزم کرلے تو خدا پر توکل کر، بیشک خدا توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

(قرآن مجید 3:159)

(ب) فَمَا أُوتِيتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَى الخ

جو کچھ تمہیں دیا گیا وہ دنیاوی زندگی کا ایک حق تمتع ہے اور بس
ورنہ خدا کے پاس جو چیز ہے، وہ بہتر اور زیادہ پائدار ہے، یہ ان
لوگوں کو ملے گی جو اپنے رب پر ایمان لاتے اور اس پر توکل
کرتے ہیں اور جن کے معاملات باہمی مشورہ سے طے ہوتے
ہیں اور جو اس چیز کو خرچ (خیرات) کرتے ہیں جو ہم نے اُن کو
عطا کی۔ (قرآن مجید 42:36 تا 38)

(ج) طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ
فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ

(مشیروں وغیرہ کے لیے فیصلے کے بعد) اطاعت اور فیصلے کے
وقت قول معروف ہونا چاہیے اور پھر جب کسی کام کا عزم کر لیا
جائے تو اگر وہ لوگ خدا سے اپنے کیے ہوئے وعدے کو پورا کریں
تو انہی کے لیے اچھا ہے۔ (قرآن مجید 47:21)

غرض اگر مشورہ لینے کی ایک طرف پابندی عائد کی گئی ہے تو دوسری طرف مشورہ کے بعد جو بھی چیز قرار پا جائے اسکی تعمیل کرنا بلا لحاظ اس کے کہ وہ اپنی رائے اور مشورے کے مطابق تھی یا مخالف ضروری قرار دیا گیا ہے، ساتھ ہی اس کا بھی ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آخری ذمہ داری چونکہ حکمران پر ہوتی ہے اس لیے اس کو مشورے کے متعلق حق تنسیخ دیا گیا ہے جیسا کہ قرآن مجید ۶:۱۱۷ میں بیان کیا گیا ہے۔

قانون سازی:

قرآن مجید نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول وفعل کو اُسوۂ حسنہ اور قانون کی حیثیت دی ہے: (دیکھیے قرآن مجید 3:53 تا 4، 4:59 و 7 وغیرہ) اس حکم کے باعث اسلامی فقہاء یا قانون سازوں کا کام آسان تر ہو گیا کیونکہ ایک طرف تو جن چیزوں کا ذکر قرآن مجید میں نہ تھا ان کے لیے حدیث نبوی میں کافی مواد مل گیا اور دوسری طرف یہ بھی دیکھا گیا کہ خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ قیاس

اور استنباط سے کام لیا، بلکہ اسکی صراحت کے ساتھ اجازت بھی دی تھی جیسا کہ معاذ بن جبلؓ گورنر یمن کے تقرر نامے وغیرہ میں مذکور ہے، اگرچہ قرآن اور حدیث کی قیاس کے ذریعہ سے تنسیخ نہیں ہوسکتی، لیکن قیاس اور تعبیر کی اجازت سے علماء وفقہاء کو انفرادی رائے سے کام لینے کی خاصی گنجائش مل گئی حتیٰ کہ یہاں تک تسلیم کیا گیا کہ مجتہد سے غلطی ہونے کے امکان کے باوجود اسکو اس کام سے نہیں روکا جا سکتا، چنانچہ ایک حدیث میں مذکور ہے کہ ''اجتہاد کرنے والا خطا بھی کرسکتا ہے، صواب کو بھی پہنچ سکتا ہے اور صحیح فیصلہ کی صورت میں اسے دو ثواب ملیں گے اور خطا کی صورت میں ایک ثواب۔'' اس طرح اس کا بھی موقع نکل آیا کہ ایک مجتہد کے بعد دوسرا مجتہد بھی اجتہاد کرے اور کسی بہتر نتیجہ پر پہنچنے کے باعث سابقہ مجتہد کا فیصلہ منسوخ قرار پائے اور خود اجماع کے متعلق بھی فقہاء نے ایسی ہی سہولت تسلیم کی ہے۔ جب تک ان اجازتوں سے فائدہ اٹھایا جاتا رہا، اسلامی قانون میں زمانہ کا ساتھ دینے کی گنجایش رہی اور وہ ترقی کرتا رہا اور جب سے قدیم فقہاء کے فیصلوں کے خلاف اجتہاد کا دروازہ چند لوگوں نے بند کردیا تو اس سے قانون اسلامی کو بے حد نقصان پہنچا، لیکن یہ مسئلہ یہاں دائرہ بحث سے خارج ہے۔

جہان بانی کے قواعد:

قرآن مجید میں اندرونی و بیرونی سیاست کے قواعد خاصی تفصیل سے ملتے ہیں جن سے حالتِ امن و صلح و غیر جانبداری میں حکمران کی رہنمائی مقصود تھی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک مملکت قائم کی اور اس ملک میں جہاں ہمیشہ سے نراج سا چلا آ رہا تھا، ایک مرکزیت اور ایک مملکت قائم کی اور عربوں کو خانہ جنگیوں کے ذریعہ اپنی توانائیوں کو ضائع کرنے سے روک کر انہیں اپنے زمانہ میں دنیا کی سب سے بڑی فاتح اور نوآبادکار قوم بنا دیا اور ان کے ذہنوں سے احساسِ کمتری کو کلی طور پر دور کر کے ان میں وہ صحت اور جذبہ بھر دیا، جسے احساسِ برتری یا احساسِ خودشناسی کہا جا سکتا ہے اور جو کسی ترقی پذیر قوم کے لیے اس قدر ضروری ہوتا ہے، چنانچہ:

(الف) كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ

بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

تم وہ بہترین قوم ہو جو انسانوں کے لیے پیدا کی گئی، تم اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بری بات سے روکتے ہو۔

(قرآن مجید 3:110 نیز 3:19 و 3:85)

(ب) اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا الخ

ان لوگوں کو جن سے لڑا جا رہا تھا (برابر کا جواب دینے کی) اجازت دیدی گئی، کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا تھا .... یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ خدا کی عبادت کو قائم کر دیں اور زکوٰۃ دیں، اچھی بات کا حکم دیں اور بری بات سے روک دیں۔ (ایضاً 22:39 تا 41)

(ج) وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ

ان سے اس وقت تک لڑتے رہو تا آنکہ فتنہ باقی نہ رہے اور خدا ہی کا دین چھا جائے۔ (ایضاً 8:39)

(د) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا الخ

اے محمد ہم نے تجھے صرف اس لیے بھیجا ہے کہ تمام لوگوں کے لیے بشیر و نذیر بنے، گو اکثر لوگ اسے نہیں جانتے۔ (ایضاً 32:28)

غالباً یہی وہ ایقان یا احساسِ فرض تھا جس نے انہیں دنیا میں حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کے لیے اپنی ہر چیز کو قربان کر دینے کے لیے آمادہ کر دیا۔ جہاد کا جو حکم مذکورۂ بالا اور دیگر آیات قرآنی میں ملتا ہے اس کا منشاء یہ بالکل نہ تھا کہ دوسروں کی جائداد لوٹی جائے، بلکہ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ ایک مقدس ترین اور بڑا ایثار طلب فریضہ تھا کہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر دوسروں کی رہنمائی کریں اور ان کو سیدھا راستہ دکھائیں۔ یہ بار بوئض خدا کی راہ میں تھا اسے انہوں نے ہنسی خوشی برداشت کیا۔

قانون بین الممالک کے خاصے تفصیلی احکام ہمیں قرآن مجید میں ملتے ہیں جن

پر مختلف مقالے بھی لکھے جاتے رہے ہیں (چنانچہ اسلامک کلچر حیدر آباد میں جنوری ۱۹۴۱ء و مابعد کے پرچوں میں کئی سو صفحوں کا ایک طویل مقالہ چھپا ہے، اسکی کتابیات میں سابقہ اہلِ علم کی کوششوں کی بھی تفصیل ہے) یہاں ان کی تفصیل کی گنجایش نہیں، صرف اس قدر اشارہ کافی ہے کہ قرآن مجید میں انتقامی جنگ (2:190 تا 195) معاہدات کی تعمیل (9:7) مدافعت (4:75، 22:39، 41 تا 41) ہمدردانہ جنگ (8:72) فریق ثانی کی طرف سے معاہدہ شکنی کا خوف (8:58) مذہبی رواداری (2:256، 109:6، 10:100) غیر مسلم رعایا سے برتاؤ (9:29) قیدیوں سے برتاؤ (4:47 و 76:8 تا 9) پناہ جویوں کو امن دینا (9:6) مفتوحہ اراضی کا انتظام (7:10) صلح کرنا (8:61) غیر جانبداری (4:88 تا 91، 59:11 تا 12، 60:8 تا 9) وغیرہ وغیرہ امور کا اصولی ذکر ملتا ہے۔

قومی دولت:

کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ

تاکہ وہ تم میں سے صرف مالداروں میں گردش نہ کرتی رہے۔

(قرآن مجید 59:7)

یہ اسلامی اصولِ دولتِ عامہ کا خلاصہ ہے جو قرآن مجید نے پیش کیا ہے، اسلامی معاشیات کے پیشِ نظر یہ چیز رہی ہے کہ دولت کی ملک کے ہر طبقہ میں تقسیم عمل میں آئے اور وہ یکجا اکٹھی نہ ہو بلکہ گردش کرتی رہے، معیار سے زائد دولت پر لازمی محصول (یعنی زکوٰۃ) وصیت کرنے کے اختیارات کی تحدید اور کسی شخص کی جائداد سے اسکی وفات پر اس کے قریبی رشتہ داروں کو لازمی طور سے حصہ ملنا، نیز غربا اور محتاجوں کے لیے حکومت کی آمدنی میں لازمی طور سے حصہ مقرر کیا جانا، یہ اور اس کے مماثل قاعدے قرآن مجید نے مقرر کیے ہیں جن سے تقسیم وگردشِ دولت کا مقصد پورا ہوتا ہے اور ساتھ ہی انفرادی ملکیت پر کوئی قید عائد نہ ہونے سے ہر شخص کو اپنے قوائے فطری سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کی ترغیب ہوتی رہتی ہے اور سود کی ممانعت اور قرضہ ہائے حسنہ کا

انتظام جو قرآن مجید نے کیا ہے، وہ اسلامی قواعدِ معاشیات کو ایک مکمل نظام کی حیثیت دیدیتے ہیں، جو نہ تو سرمایہ داری ہے اور نہ اشتراکیت، بلکہ اس میں ان دونوں کی خوبیاں ہیں اور ساتھ ہی دونوں کی برائیوں سے اس نظام کو محفوظ رکھنے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔

اخلاق عامہ:

میرے نزدیک مذہب اور سیاست دونوں ایک دوسرے سے ممتاز عمل ہیں ان کو ایک سمجھنا غلطی ہے، مذہب انسان اور خالق کے تعلق کا نام ہے اور سیاست بندوں کے باہمی تعلقات کے لیے برسرکار ہوتی ہے، لیکن اگر ان دونوں میں کوئی رابطہ اور حلقۂ اتصال نہ پیدا کیا جائے تو انسانیت کو لامحدود نقصان پہنچ جاتا ہے، اسلام نے اس کا ایک حل تلاش کر لیا اور اس کو کامیابی سے عمل میں لا کر بھی دکھا دیا اور وہ یہ تھا کہ اگرچہ مذہب اور سیاست دونوں کے دائرہ ہائے عمل بالکل جدا جدا ہیں لیکن دونوں کے قواعد کا ماخذ ایک ہی چیز کو قرار دیا گیا، چنانچہ مسلمانوں کا مذہب اور مسلمانوں کی سیاست دونوں کی رہنمائی قرآن وحدیث، اصولِ انصاف واستحسان اور ہم آہنگی ضمیر سے ہوتی ہے۔

سیاسی اصطلاحات:

اسلامی ادارہ ہائے سیاست نے اپنی بہت سی اصطلاحیں قرآن مجید ہی سے لی ہیں، چنانچہ امت اور ملت سے سیاسی جماعت مراد ہوتی ہے، خلیفہ اور امام اس جماعت کے سردار کا نام ہوتا ہے، (دیکھیے قرآن مجید 8:42 نیز سیرۃ ابن ہشام ص 341 میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر مدینہ کے لیے ہجرت کے بعد جو دستورِ مملکت نافذ فرمایا تھا اور جس کا پورا متن خوش قسمتی سے ہم تک پہنچ چکا ہے، اس کی دفعہ 2 میں بھی انہی اصطلاحات کو استعمال کیا گیا ہے، لفظ خلیفہ کے لیے دیکھیے قرآن مجید 38:27 اور لفظ امام کے لیے 2:124)۔

جانشینی:

لفظ خلیفہ کے ساتھ ہم جانشینی کے خاردار مسئلہ سے دوچار ہو جاتے ہیں، یہی وہ

مسئلہ ہے جس نے تیرہ سو سال سے مسلمانوں کو دو بڑی متخاصم جماعتوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جو اسلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لیے لائے تھے اور جس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمر بھر تبلیغ کرتے رہے، اس کے بنیادی اصولوں میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں ہے کہ آپ کی جانشینی کے لیے کیا اصول ہو اور اس اصول کا ماننا اس سے بھی کم ایک جز عقیدہ امر بن سکتا ہے لیکن بدقسمتی سے اس کے بالکل برعکس صورت حال پیدا ہو گئی اور ہر دو فریقوں کے ہاں غلو رکھنے والے خیالات بھی پھیلتے رہے، حالیہ زمانہ میں ایک حل جو اس کے لیے سوچا گیا ہے وہ سنجیدہ غور کا مستحق ہے، وہ یہ کہ سنی اور شیعہ دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ تاریخی واقعہ کی حیثیت سے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علیؓ پہلے خلیفہ نہیں ہوئے، اسی طرح شیعہ اور سنی دونوں ہی اس پر متفق ہیں کہ روحانی امور میں حضرت علیؓ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفۂ بلافصل (معارف: ''خلیفہ بلافصل'' کے معنی گویا یہ ہوئے کہ جس نے براہ راست مشکواۃ نبوت سے فیض پایا ہو، اس معنی کے لحاظ سے تمام اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم خلفائے بلافصل تھے اور عالم روحانی میں تعدد خلفاء بلافصل ممنوع نہیں) ہیں، چنانچہ چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ وغیرہ قریب قریب تمام صوفی سلسلے اس کو مانتے (اور یوں بھی عالم مادی میں ''دو شاہان درا قلیمے نہ گنجند'' صحیح ہو تو پھر عالم روحانی میں ایک سے زیادہ خلیفہ بلافصل ہونے میں کوئی مانع نہیں) ہیں۔ اب رہا یہ امر کہ حضرت علیؓ کو سیاسی جانشینی کا بھی استحقاق تھا یا نہیں، یہ ایک خالص علمی مسئلہ رہ جاتا ہے، جس کو آئے دن کی روزمرہ سیاسی زندگی پر اب تیرہ سو سال بعد اثر انداز کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔

جس طرح ایک نبی کے بعد دوسرے نبی کے آنے تک اوّل الذکر ہی کی شریعت باقی رہتی ہے، اسی پر قیاس کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک حکمران کی وفات کے باوجود اس کے جانشین کے انتخاب تک اوّل الذکر ہی کا اقتدار جاری رہتا ہے اور اسی کے مقرر کردہ افسر اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہنے کے پابند ہیں، چنانچہ:

كَانَ أَبُو حنيفة يقول اذا مات الخليفة فالقاضي على

قضائه والوالی علیٰ ولایته حتیٰ یغیرله القائم بعده۔

(مناقب ابی حنیفہ للموفق ج 1 ص:87-88)

امام ابوحنیفہ فرماتے تھے، اگر خلیفہ کا انتقال ہو جائے، تو قاضی اپنی قضائت پر اور والی اپنی حکومت پر باقی رہتا ہے، جب تک خلیفہ کا جانشین اسے بدل نہ دے۔

یہ سرسری خاکہ زیادہ قابل اہلِ علم کے لیے دعوت ہے، کہ اس اہم موضوع پر توجہ کر کے ملک وملت کی رہنمائی کریں۔

VI
مسلم مملکت میں مالیاتی نظم ونسق

بدھ مت اور عیسائیت کے برعکس کہ جو اس دنیا کی دولت اور خوشحالی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اسلام کا اصول جس کا تذکرہ قرآن پاک میں موجود ہے یہ ہے کہ "اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں نیکی دے اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور ہمیں جہنم کے عذاب سے نجات دے۔" (201/2) ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے "جس مال کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری گزران کا ذریعہ بنایا ہے" (5/4) ایک اور فرمان ہے "اور اپنے دنیاوی حصے کو بھی نہ بھول اور جیسے کہ اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے" (77/28)۔

ہر شخص میں روزی کمانے کی صلاحیت مختلف ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان پر بے پایاں رحمتوں کی جو بارش کی ہے تو ان لوگوں پر جو مالی خوشحالی کی نعمت سے بہرہ ور ہیں غریبوں اور ناداروں کے ضمن میں کچھ فرائض بھی ڈال دیئے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا پیغمبر مقرر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جو پہلی وحی نازل فرمائی وہ یہ تھی "اور تجھے نادار پا کر تونگر نہیں بنا دیا؟ پس یتیم پر تو بھی سختی نہ کیا کر اور نہ سوال کرنے والے کو ڈانٹ ڈپٹ اور اپنے رب کی نعمتوں کو بیان کرتا رہ (93/8-11)

اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروکاروں کو ہمیشہ فراخدلی سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی تلقین کی اور خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں سے بڑھ چڑھ کر خرچ کرتے رہے اور آخر کار دوسرے انسانوں کی مدد کو فرائض کا حصہ بنا دیا۔ اس کا وقت اور شرح مقرر فرما دی اور انکار کرنے والوں کے لیے سزا کا بھی اہتمام کیا۔ قرآن پاک میں اس حوالے سے جو اصطلاحات مذکور ہیں ان میں زکوٰۃ، صدقات، انفاق فی سبیل اللہ،

حق، نصیب شامل ہیں۔ ان سب کا مفہوم کم وبیش ایک ہے یعنی اللہ کی خوشنودی کے لیے غریبوں اور محتاجوں پر خرچ کرنا۔ بعد میں اس کے لیے سختی اور سزا کا اضافہ ہوا اور زکوٰۃ ٹیکس کی ادائیگی لازمی قرار پا جانے کے بعد بھی قرآن بدستور مستحق لوگوں پر خرچ کرنے کی ترغیب دلاتا رہا بلکہ انسانوں کے ساتھ جانوروں کے بارے میں بھی تاکید کی۔ زیر نظر جائزے میں ہم قرآن پاک کی آیت (60/9) تک اپنی تحقیق کو محدود رکھیں گے جسے سرکاری خزانے کے اخراجات کے حوالے سے کم وبیش ایک قانون کی حیثیت حاصل ہے جس میں ان تمام لوگوں کی فہرست دے دی گئی ہے جو سرکاری خزانہ سے فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ یہ اخراجات ایک فرض کا درجہ رکھتے ہیں۔ ''صدقات (مسلمانوں سے موصول ہونے والے سرکاری محاصل) غریبوں، فقرا اور محتاجوں (مساکین)، ٹیکس وصول کرنے والے اہلکاروں اور ان لوگوں کے لیے جن کے دل جیتنے جانے مقصود ہیں اور غلاموں اور قیدیوں (جنگی) کی رہائی کے لیے اور قرضداروں کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لیے ہیں۔ یہ فرض ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔'' (60/9)

چونکہ ایک فلاحی ریاست کے تمام تقاضوں کو آئت کی محدود جگہ میں سمونا ممکن نہیں اس لیے اس آئت کی تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے۔ صدقات سے آٹھ درجوں کے لوگ فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ لفظ صدقات، صدقہ کی جمع ہے جو زکوٰۃ کا ہم معنی ہے اور جس وقت اس حوالے سے وحی نازل ہوئی (9 ہجری) اس سے مراد وہ تمام ٹیکس تھے جو مسلمان سالانہ مختلف قابل محصول اشیاء پر ادا کرتے تھے۔ قابل محصول اشیاء میں زرعی پیدوار، تجارتی آمدنی، کانوں سے حاصل ہونے والی پیداوار، گھریلو جانور (بھیڑ، بکری، گائے، اونٹ وغیرہ) شامل تھیں مگر کوئی مقررہ شرح نہ تھی جو آٹھ قسم کے افراد اس کے مستحق ہو سکتے تھے وہ یہ ہیں:

2،1) فقراء، مساکین ان اصطلاحات کا سادہ ترجمہ تو ہے ضرورت مند اور غریب مگر مفسرین اور فقہاء نے ان کے حقیقی معانی کی تلاش میں بڑی عرق ریزی کی ہے۔ معروف اندلسی مفسر قرآن ابو حیان اپنی ''تفسیر'' میں صفحہ 58 پر رقم طراز ہیں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ

علیہ اور بعض دوسرے فقہاء کے قول کے مطابق یہ دونوں اصطلاحات ہم معنی ہیں اور یہ کہ اس ٹیکس کے فیض یافتگان میں صرف مندرجہ بالا آٹھ درجوں میں آنے والے لوگ ہی ہو سکتے ہیں جن میں سے ہر کیٹیگری کے لوگوں کو وصول شدہ محاصل کا آٹھواں حصہ ملے گا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت بے پایاں نے چونکہ غریب اور ضرورت مند (ایک ہی کیٹیگری کے لوگوں کا دوبارتذکرہ) دولفظ کہے ہیں اس لیے انہیں 2/8 حصہ ملے گا۔

تاہم خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن خطاب کی رائے میں (بحوالہ خراج از ابو یوسف صفحہ 72، علامہ شوکانی کی کتاب فتح القدیر 2، 357 بحوالہ ابن ابی شیبہ۔ بلاذری کی فتوح البلدان 129، تفسیر طبری X، 110 تفسیر ابو حیان صفحہ 58) فقرا سے مراد غریب مسلمان اور مساکین سے مراد غریب غیر مسلم ہیں۔ زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ثابت، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے بھی یہی ہے۔ سامی روایات بھی اسی نظریے کی تائید کرتی ہیں۔ شاہ بابل حمورابی کے قانون میں بھی ایک لفظ مشکینا مستعمل ہے جو عربی کے مسکین کے مترادف ہے۔ اس سے مراد اقلیتی شہری (مسلمانوں میں یہ لوگ غیر مسلم شہری ہوں گے) کے ہیں۔ یہ لفظ ساکن سے نکلا ہے جس کے معنی قیام کرنے والا ہیں۔ آرام اور وقفہ کرنے کے معانی میں استعمال نہیں ہوتا۔

3) ٹیکس وصول کرنے والے: اس سے مراد ٹیکسوں کی وصولی، اس کا حساب کتاب رکھنے والے اور اس کے علاوہ اس کے اخرجات کا ریکارڈ رکھنے والے سب لوگ اس مد سے معاوضہ لینے کے اہل ہیں۔ اس فنڈ سے رقوم لینے کے اہل فراد کی فہرست دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس دور میں بلکہ آج کے دور میں بھی عملی طور پر انتظامیہ کے تمام افراد اس کیٹیگری میں آ جاتے ہیں۔ یہاں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک مشہور خط کا حوالہ دینا مناسب ہوگا جس میں انہوں نے گورنر شام کو ہدائت کی تھی کہ مدینہ کے محکمہ خزانہ کا نظام چلانے کے لیے کسی باصلاحیت ماہر حساب کو بھجوایا جائے۔

ابعث الینا رومی یقیم لنا حساب فرائضنا (بحوالہ انساب الاشراف از بلاذری) یقیناً رومی حساب دان غیر مسلم ہوگا جو تھوڑی بہت عربی جانتا ہوگا۔

4) جن کے دل جیتے جانے مقصود ہیں (مولف القلوب) اس سے مراد وہی رقوم ہیں

جو آج ''سیکرٹ فنڈ'' کے طور پر معروف ہیں جو ملکی اور قومی مفاد میں مخصوص مقاصد کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ تاہم یہ موضوع قدرے تفصیل کا طالب ہے۔

i) بعض خصوصاً حنفی فقہا اس بات پر سختی سے یقین رکھتے ہیں کہ اخراجات کی یہ مد اب متروک ہو چکی ہے۔ ان کے اس یقین کی بنیاد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعض اقدامات ہیں۔ اس حوالے سے مختلف روایات ہیں بعض کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عُیینہ بن حصن الفزاری کی مالی مدد کیا کرتے تھے اور یہ سلسلہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں بھی جاری رہا تاہم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اس پر پابندی عائد کر دی اور کہا کہ اب عُیینہ جیسے لوگوں کی مدد کی کوئی ضرورت نہیں مگر یہ روایت بے بنیاد ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عُیینہ کی مدد جنگ حنین کے مال غنیمت میں سے کی تھی جبکہ یہاں مسئلہ زیر بحث زکوٰۃ سے رقم لینے والوں کا ہے نہ کہ مال غنیمت لینے والوں کا۔ ایک اور روایت میں کہا گیا ہے کہ مدینہ کے محکمہ خزانہ میں ملازم ایک غیر مسلم شخص نے اسلام قبول کر لیا غالباً یہ وہی رومی ماہر مالیات تھا جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے اور بعض صحابہؓ نے اسلام کے حوالے سے جذبہ خیر خواہی کے تحت خلیفہ کو مشورہ دیا کہ اس نومسلم کی تالیف قلب کے لیے زکوٰۃ فنڈ سے مدد فراہم کی جائے تاکہ اسلام قبول کرنے والوں کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ مشورہ قبول کرنے انکار کر دیا (ممکن ہے یہ فیصلہ انفرادی نوعیت کا ہو اور بطور اصول یا ضابطہ نہ ہو کیونکہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک قرآنی حکم کو جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی عمل ہوا اور پہلے خلیفہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اس روائت کو برقرار رکھا اسے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے فہیم صحابیؓ اور خلیفہ ترک کر دیں) ویسے بھی ایک حکمران کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ امداد کے مستحق لوگوں کا انتخاب کر سکے نہ کہ بغیر سوچے سمجھے سرکاری خزانہ خرچ کرتا پھرے۔ ابن رُشد اپنی کتاب ''بدایۃ المجتہد'' کے باب زکوٰۃ میں لکھتے ہیں کہ نہ صرف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بلکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی یہ رائے دیتے ہیں کہ مذکورہ آئت قرآنی ہرگز متروک نہیں ہوئی۔

ii) تفسیر طبری جلد X، صفحہ 113 پر مذکور ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے ٹیکس (صدقہ) دو

مقاصد کے لیے نافذ فرمایا ایک مسلمان غربا کی مدد کے لیے اور دوسرا اسلام کو مدد فراہم کرنے اور اسے مضبوط بنانے کے لیے۔ چنانچہ یہ واضح ہے کہ احلام کی مدد اور اسے مضبوط بنانے کے لیے امیر ادر غریب دونوں کو مال دینا پڑے گا کیونکہ رقم وصول کرنے والے کے ذاتی مفاد میں نہیں بلکہ اسلام کو مضبوط بنانے کے لیے دی جائے گی۔ اس طرح جن لوگوں کو دل جیتے جانے مقصود ہوں گے انہیں مال دینا پڑے گا چاہے وہ امیر ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ اس کے پس پردہ مقصد اسلام کو تقویت پہنچانا ہے، اس لیے ان لوگوں کے اس موقف میں کوئی وزن نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ آج کے دور میں غیر مسلموں کے دل جیتنے کی ضرورت نہیں کیونکہ مسلمانوں کی تعداد اب کم نہیں ہے اور اسلام اب اتنا طاقتور ہے کہ وہ دشمنوں کے حملوں سے اپنا دفاع کر سکتا ہے۔ اسی تفسیر طبری میں ہی صفحہ 110 پر کہا گیا ہے کہ ''عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن خطاب اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سمیت بعض دوسرے لوگوں کی رائے ہے کہ قرآنی اصطلاح فقرا، مساکین میں فقرا سے مراد مسلمان غربا اور نادار اور مساکین سے مراد غیر مسلم نادار ہیں۔ ایک اور مثال میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدینہ کے ایک غریب یہودی کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا اور جواز یہ پیش کیا کہ یہ مسکین اہل کتاب ہے (''خراج'' از ابو یوسف صفحہ 72)۔ مزید کہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ معائنہ وغیرہ کے لیے شام تشریف لے گئے تو انہوں نے غریب عیسائیوں کو مسلمانوں کے زکوٰۃ فنڈ سے وظائف جاری کرنے کا حکم دیا (صفحہ 129 فتوح البلدان از بلاذری) ان سے بھی قبل حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں ان کا بھی یہ معمول تھا اور مسلم کمانڈر خالد بن ولید نے بے آسرا اور لاوارث غیر مسلموں کی مسلمانوں کے محاصل سے مدد کی تھی۔ (''خراج'' از ابو یوسف صفحہ 84-85 میری تصنیف الوثائق السیاسیۃ 291)۔

5. ممتاز حنفی فقیہ الکاسانی (بدائی II-صفحہ 45)، شافعی عالم علامہ شوکانی (فتح القدیر II صفحہ 365)، حنبلی فقیہ ابویعلیٰ (احکام السلطانیہ صفحہ 116) اور عظیم صوفی ابن عربی (تفسیر صفحہ 394-395) ان سب کی رائے ہے کہ غیر مسلم زکوٰۃ میں سے امداد لینے کے قانونی طور پر اہل ہیں۔ ان میں سے ابویعلیٰ کا قول نسبتاً جاندار اور وقیع ہے۔ کہتے ہیں ''جہاں

تک ان لوگوں کا تعلق ہے جن کے دل جیتنے جانے مقصود ہیں ان کے چار درجے ہیں:

i) کسی غیر مسلم کی اس لیے حمایت حاصل کی جائے کہ اس سے مسلمانوں کو مدد مل سکے۔

ii) کچھ لوگوں کی دلجوئی کی جائے کہ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے باز رہیں۔

iii) کچھ لوگوں کی دلجوئی کر کے انہیں اسلام کی طرف راغب کیا جا سکے۔

iv) ایسے لوگوں کی دلجوئی کی جائے کہ ان کے رشتہ داروں اور دوستوں کو اسلام کی طرف مائل کیا جا سکے۔ مندرجہ بالا مقاصد کے لیے خرچ کیا جا سکتا ہے چاہے وصول کرنے والے مسلمان ہوں یا غیر مسلم (ابویعلیٰ الفرا + الاحکام السلطانیہ صفحہ 116)۔

6. زکوٰۃ کا پانچواں مصرف گردنیں چھڑوانے کا ہے۔ اس سے یقینی طور پر دو قسم کے لوگ مراد ہیں۔ (i) دشمن کی قید سے مسلمان قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑوانا (ii) غلام آزاد کروانا۔ جہاں تک قیدیوں کا تعلق ہے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا ایک حکم موجود ہے (ابن سعد V، صفحہ 260، 272) کہ ''اسلامی ریاست کے مسلمان اور ذمی (غیر مسلم) شہریوں میں کوئی امتیاز نہ کیا جائے۔'' جہاں تک غلاموں کو آزاد کروانے میں مدد کا تعلق ہے یہ اسلام کی ایک منفرد خصوصیت اور اعزاز ہے اور دنیا کا کوئی دوسرا نظام یا قانون چاہے مشرق ہو یا مغرب غلام کے لیے اس طرح درد نہیں رکھتا جس کا مظاہرہ اسلام نے کیا ہے۔ اندازہ کیجیے کہ بائبل دشمنوں کو غلام بنانے کا حکم دیتی ہے مگر نہ تو عہد نامہ قدیم اور نہ عہد نامہ جدید میں انہیں آزاد کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ رومیوں کے ہاں بھی غلام ابتر صورتحال سے دوچار تھے اور لیگے (Leage) کے مطابق مسیحیت کی آمد کے بعد تو ان کی حالت اور بھی خراب ہو گئی (رومن پرائیویٹ لاء صفحہ 55-62)۔ غلاموں کی آزادی کے لیے حکومتی امداد کا حکم صرف اسلام نے دیا ہے گو کہ غلاموں کی بہبود کے لیے بہت سے دوسرے احکام اس کے علاوہ بھی ہیں۔ (ملاحظہ ہو میری اردو کتاب ''رومی اور اسلامی ادارہ غلامی''۔

7. وہ جن پر قرض (یا مصیبت) کا بھاری بوجھ ہے۔ (الغارمین) قرآن کریم کے شارحین اور فقیہوں کے مطابق اس سے وہ غریب ہرگز مراد نہیں جن کا ذکر I اور II کیٹیگری

میں کر دیا گیا ہے بلکہ وہ آسودہ حال لوگ ہیں جنہیں وقتی طور پر مدد کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً سیلاب یا زلزلہ کے متاثرین یا ایسے مسافر جن کا زادراہ چوری کر لیا جائے، جس سے غلطی سے غیر ارادی طور پر قتل ہو جائے اور اس کے پاس دیت کی ادائیگی کے لیے رقم نہ ہو (ایک سو اونٹ یا کم و بیش)۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن خطاب کے دور خلافت میں ایک قانون بنایا گیا تھا۔ انہوں نے سود سے پاک قرض کا ایک فنڈ قائم کیا تھا (مؤطا از امام مالک 1/32)۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس فنڈ سے خود بھی قرض لیتے اور تاجروں کو بھی دیتے اور منافع کا ایک حصہ خود اور دوسروں سے لے کر سرکاری خزانہ میں جمع کرواتے جو مضاربہ اور کمرشل بنک جیسا کام تھا۔

8. اللہ کے راستے میں (فی سبیل اللہ)۔ اس کی تشریح بڑے جامع انداز میں کی گئی ہے۔ جنگ میں جانے والے مجاہدوں کی مدد کرنا، علاقے کے دفاع کے لیے تعمیرات کرنا۔ مساجد، سکول، سرائے، بیواؤں، بوڑھوں، معذوروں، یتیموں کے لیے مفت قیام گاہوں کی تعمیر۔ مسافروں کو مقامی مسلمان آبادی کے مہمان کا درجہ حاصل ہوتا تھا۔

9. ابن السبیل (سڑک کا بیٹا) کے لیے۔ یہ اصطلاح ان مسافروں کے لیے ہے جو آگے جانے سے قبل آرام کے لیے پڑاؤ ڈالے ہوئے ہوں۔ نہ صرف اس کی مہمان نوازی پر خرچ کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کی دیگر ضروریات بھی پوری کی جا سکتی ہیں مثلاً اس کی حفاظت کے لیے اقدامات پر بھی رقوم خرچ کی جا سکتی ہیں۔ پلوں کی تعمیر اور صحت کی سہولتیں فراہم کرنا بھی ریاست کی ذمہ داری ہے۔

سربراہ ریاست کے اخراجات

یہ امر قابل ذکر ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف کی جو فہرست زیر بحث آئی ہے اس میں سربراہ ریاست یا مملکت کا کوئی تذکرہ نہیں۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح اور معروف احادیث ہیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ زکوٰۃ کا مال پیغمبر، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلے بنو ہاشم اور بنو مطلب کے افراد کے لیے ممنوع ہے۔ (فقہ کی کوئی بھی کتاب - باب زکوٰۃ)

محاصل کا جمع کرنا

چونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی مسلمانوں کے لیے فرض قرار دی گئی اس لیے اس کے جمع کرنے کے لیے انتظامی ادارہ قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی لیکن دوسرے محاصل کے لیے یہ صورت نہ تھی مثلاً معاہدوں کی واجب الادا رقوم کی وصولی خصوصاً غیر مسلموں سے قابل الوصول رقوم۔ چنانچہ جب 7 ہجری میں خیبر فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو اجازت دے دی کہ وہ اپنے گھروں میں بدستور مقیم رہیں تاہم ان کو پابند کیا کہ وہ اپنی کھجور کی پیداوار میں مسلمانوں کو نصف کا شریک کریں۔
(بخاری شریف 64 / 40)۔ اس مقصد کے لیے ہر سال مدینہ سے نمائندے بھیجے جاتے تھے۔ پہلے سال حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن رواحہ کی ڈیوٹی لگی۔ انہوں نے تمام پیداوار کو ایک جگہ جمع کرنے کا حکم دیا اور بہت احتیاط سے دو ڈھیریاں بنائیں اور مقامی آبادی کو اجازت دی کہ وہ ان میں سے کوئی ایک ڈھیری اٹھالیں۔ ان کے اس اقدام سے وہ لوگ اتنا متاثر ہوئے کہ پکار اٹھے ”خدا کی قسم ایسی دیانت داری سے ہی زمین اور آسمان قائم ہیں۔ (ابن ہشام صفحہ 777)

اس سلسلے میں ایک اور روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابن لتبیہ (یا الاتبیہ) الاسدی کو کسی علاقے میں محاصل پر مامور فرمایا۔ جب وہ (وصولی کے بعد) مدینہ واپس آئے تو کہنے لگے ”فلاں فلاں چیزیں تو سرکاری ہیں جب کہ فلاں فلاں مجھے ذاتی تحفہ میں دی گئی ہیں۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں ایک بلند مقام پر کھڑے ہو گئے اور فرمایا ”یہ کیا بات ہوئی کہ ٹیکس جمع کرنے والے آ کر کہیں کہ یہ چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اور یہ چیز ہمیں تحفہ میں ملی۔ اسے اپنے ابا اماں کے گھر بیٹھے رہنے دو پھر دیکھتے ہیں اسے کتنے تحفے ملتے ہیں۔ خدا واحد کی قسم، غیر قانونی اور ناجائز طریقوں سے کمایا گیا مال قیامت کے روز ان کے مالکوں کی گردن پر لدا ہوگا۔ کیا یہ بات میں نے تم تک پہنچا دی ہے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات تین دفعہ دہرائی)۔ (بخاری 24:93)۔

زکوٰۃ جو ابتدا میں رضاکارانہ محسوس ہوتی تھی 9 ہجری میں جب فرض ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وصولی کے لیے نمائندے بھجوانا شروع کیے۔ صوبائی گورنروں نے ٹیکس وصولی اور اخراجات کے لیے مقامی سطح پر انتظامیہ قائم کر لی جس کی نگرانی مرکزی حکومت کرتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زرعی پیداوار، تجارت، درآمد و برآمد کے مال، کانکنی، گھریلو جانوروں (سرکاری چراگاہوں پر پلنے والے اونٹ، گائے، بھیڑ، بکریاں) پر ٹیکسوں کی شرح مقرر کر دی۔ اس ضمن میں کم سے کم کی حد بھی مقرر کر دی گئی جس سے کم تعداد پر ٹیکس معاف ہوتا تھا۔ دلچسپ اور قابل ذکر امر یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچ رہنے والی آمدنی کو بھی ٹیکس نیٹ میں شامل کر دیا اور اس ٹیکس کے پس پردہ حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ نقد رقم جمع کرنے کی بجائے گردش میں رہنی چاہیے۔ عبدالقیس قبیلے کے ساتھ اسلام قبول کرنے کے بعد جو معاہدہ کیا گیا وہ دُور رس نتائج کا حامل تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ:

اہل قبیلہ کو یہ حق حاصل ہو گا کہ ان کی فصلوں کی پیداوار کے راستے بند نہیں کیے جائیں گے۔ نہ ہی انہیں بارش کے بعد گھاس کی تلاش میں اپنے ریوڑوں کے ساتھ جانے کی ممانعت ہو گی اور نہ ہی پھل پکنے کے بعد اتارنے پر کوئی پابندی ہو گی (یعنی انہیں محاصل جمع کرنے والوں کی آمد کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں) (ابن سعد I / (ii) صفحہ 32-33- میری تصنیف الوثائق نمبر 72۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اراضی پر ٹیکس فصل کی کٹائی پر تھا کسی خاص مہینے سے مخصوص نہ تھا۔ ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے لوگوں پر اعتماد ہے کہ وہ فصل اٹھانے کے بعد بھی ٹیکس وصول کنندگان کو پیداوار سے آگاہ کر دیں اور دوسری طرف آپ صلی اللہ لیہ وسلم نے کیلنڈر کی ممکنہ تبدیلی کے بارے میں بھی اشارہ کر دیا تھا۔ جلد ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں کا پرانا قمری- شمسی کیلنڈر ترک کر دیا اور مکمل طور پر قمری کیلنڈر اپنا لیا جس میں موسموں کی آمد و رفت کا اندازہ مہینوں کی گردش سے ہو جاتا ہے جس کے بعد ٹیکس وصول کنندگان قمری حساب سے مقررہ مہینوں میں علاقوں میں جانے لگے چاہے وہ وقت فصلوں کی برداشت کا ہو یا نہ ہو۔ اس عمل کے نتیجے میں اسلامی حکومت کے محاصل دو درجوں

میں تقسیم ہو گئے۔ بعض کی وصولی قمری کیلنڈر کے حساب سے ہونے لگی مثلاً کانکنی، بچتیں وغیرہ جبکہ بعض کی وصولی شمسی اور موسم کے اعتبار سے ہوتی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی خزانہ شمسی اور قمری شمسی کیلنڈر کے ''مالی سال'' کے آخر پر خالی ہونے کے خطرے سے محفوظ ہو گیا کہ بعض اوقات حکومتوں کو نئے ٹیکسوں کے نفاذ سے قبل اخراجات جاریہ کے لیے رقم قرض لینا پڑتی تھی۔

حرف آخر

ہر مسلمان اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ اسلام کی عمارت کی چھت خدا کی وحدنیت ہے جو چار ستونوں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ پر قائم ہے۔ یہ ستون ایمان کے چار رکن ہیں جو یکساں اہمیت کے ساتھ فرض ہیں۔ یعنی جس طرح نماز کی ادائیگی فرض ہے اسی طرح زکوٰۃ ادا کرنا بھی فرض ہے۔ روحانی اور مادی پہلوؤں کے اس امتزاج کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے اس ریاست کے تصور کو زیرِ غور لایا جائے جس کے داعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اس میں نماز اور روزہ کو وہی حیثیت حاصل تھی جو فاضل ملکیت پر ٹیکس کی ادائیگی کو اور جہاد کو تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آدمی کی روحانی اور مادی (دینی اور دنیاوی) ذمہ داریوں کو ایک دوسرے سے لازم وملزوم کر کے ایک مکمل نظام کا حصہ بنانا چاہتے تھے جس میں مسجد اور قلعہ کو ایک دوسرے سے الگ نہ رکھا جائے۔ (مذہب اور سیاست کو الگ الگ رکھنے کی بجائے یہ ایک ہی نظام کا حصہ ہو) اور جس میں اللہ کی راہ میں مادی (دنیاوی) فرائض کو بھی روحانی فرائض کے برابر اہمیت حاصل ہو۔ قرآن مجید میں بیسیوں مقامات پر ایک ہی جگہ ''اقیم الصلوٰۃ'' اور ''اتو الزکوٰۃ'' کا تذکرہ ہے۔ ایک سیاسی مدبر کو یہ سمجھنے میں غلطی نہیں ہونی چاہیے کہ ٹیکس کی ادائیگی بھی اسی ذمہ داری اور باقاعدگی سے کرنی ہے جیسے کہ نماز اور روزہ چاہے اس بارے میں حکومت کا دباؤ یا نگرانی ہو یا نہ ہو بلکہ اگر حکومت تقاضا کرنا بھول بھی جائے تو ایک سچے مسلمان کو ٹیکس ادا کرنا چاہیے۔

پالیسی کا ایک اصول

ایک دفعہ ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ دو ساتھیوں کے ہمراہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے آئے اور کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کو کسی سرکاری ڈیوٹی پر مامور کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا ''ہم خود خواہش کرنے والوں کو سرکاری عہدہ نہیں دیتے۔'' (بخاری 2/1/37)

قدرتی طور پر جب کوئی شخص کسی کو کوئی ذمہ داری تفویض کرتا ہے تو وہ اسے آمادہ کرنے کے لیے اپنی مدد کا بھی یقین دلاتا ہے مگر جب کوئی خود کسی عہدے کی خواہش کرتا ہے تو آجر اس کو ہر کام بطریق احسن انجام دینے کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ ایک ملازم کے پاس کوئی کام کرنے کی ضروری قوت (صلاحیت) بھی ہونی چاہیے اور اسے قابل اعتماد (قوی، امین) بھی ہونا چاہیے۔ (39:27)

ایک اور مقام پر کہا گیا ہے کہ کسی منصب کے امیدوار کو دیانت دار اور اس شعبے کا ماہر ہونا چاہیے۔ (حفیظٌ علیم) (55:12)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ٹیکس کلکٹر کے طور پر مامور فرمایا اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کی تنخواہ دینا چاہی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ یہ کسی ایسے شخص کو دے دیں جسے مجھ سے زیادہ اس کی ضرورت ہو مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصرار کیا اور فرمایا ''نہیں نہیں تم لے لو۔ اگر تم کو حکومت سے کوئی رقم ملتی ہے جس کا تم نے کوئی لالچ کیا نہ ہی خواہش تو تمہیں یہ رقم لے لینی چاہیے اور اگر ایسا نہیں ہے (یعنی اگر کوئی لالچ ہے) تو پھر اجتناب کرو (بخاری 51:24)۔

ایک آخری بات جس کی شائد خصوصاً کوتاہ اندیش ذہنوں کے لیے تھوڑی سی بھی اہمیت نہ ہو کہ زکوٰۃ ایک ٹیکس ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں مسلمانوں پر زکوٰۃ کے سوا کوئی ٹیکس نہ تھا۔

VII

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بجٹ سازی اور ٹیکسیشن

کم از کم میرے علم کی حد تک قرآن وہ واحد مذہبی کتاب ہے جس میں ریاست کی آمدنی اور اخراجات کے بارے میں پالیسی کے طور پر واضح ہدایات دی گئی ہیں۔ زمانہ قبل از اسلام میں ریاست کی آمدنی سربراہ ریاست (یا سردار قبیلہ) کی ذاتی ملکیت شمار ہوتی تھی مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کر دیا کہ زکوٰۃ کا مال (ریاست کے مسلمان شہریوں کی جیب سے حاصل ہونے والی آمدنی) نہ صرف آپ صلی اللہ عہ وسلم کی ذات پاک اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے لیے حرام ہے بلکہ خاندان بنو ہاشم کے تمام افراد اور بنو مطلب کے اتحادی حتیٰ کہ برادری (Cousin Clan) کے لوگوں کو بھی اس کی اجازت سے مستثنٰی رکھا گیا ہے۔

اسلام کی اس قابل فخر اور قابل ستائش روایت پر جب بھی صدق دل سے عمل کیا گیا بدعنوانی کا خاتمہ ہو گیا اور مسلم ریاست کے شہری امن اور خوشحالی سے بہرہ ور ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے اداروں پر تحقیق کی جانب اہل علم نے اب تک زیادہ توجہ نہیں دی اور اس خلا کو پُر کرنے کے لیے کئی نسلوں تک کام کرنے کی ضرورت ہو گی۔ خوش قسمتی سے اس ضمن میں تفصیلات کی عدم دستیابی کا کوئی مسئلہ نہیں صرف بکھری ہوئی ہیں ضرورت صرف یہ ہے کہ وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے تحریری اثاثوں میں سے چن چن کر ایک جگہ جمع کر کے تصویر مکمل کر دی جائے۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بجٹ سازی اور ٹیکسیشن نظام کی کچھ تفصیلات یہاں پیش کرنے

کی کوشش کی گئی ہے۔

پس منظر:

موضوع پر کچھ کہنے سے قبل ضروری ہے کہ قبل از اسلام کے عرب کی صورتحال کا مختصراً ذکر کر دیا جائے۔ اس حوالے سے یونانی اور رومی اثرات سے صرف نظر کرتے ہوئے اور معین اور ملکہ بلقیس کے ملک سبا کی مثالوں سے بھی اجتناب کرتے ہوئے کہ ایک تو سبا کا تعلق یمن سے ہے جو حجاز سے بہت دُور ہے پھر اس بارے میں معلومات بھی ناکافی ہیں۔ ہم اپنے تذکرہ کو مکہ اور مدینہ تک محدود رکھیں گے۔

مکہ

مکہ کے اولین مکینوں کا تعلق عمالقہ سے تھا (اس قبیلے کی ایک شاخ کے لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے مصر سے خروج کے وقت فلسطین میں آباد تھے جنہیں نو واردوں نے آکر نکالنے اور ان کی زمینوں پر قبضے کی کوشش کی)۔

''مرأت الحرمین'' میں تاریخ منائیہ الکرم کے حوالے سے مذکور ہے (1،69) کہ یہ اولین آبادکار مکہ میں داخل ہونے والے تاجروں سے ان کے سامان کا دسواں حصہ (عشر) بطور ٹیکس وصول کیا کرتے تھے۔ جب تقریباً 2000 قبل مسیح میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے وقت میں مکہ کی شہری ریاست میں برادر قبائل جرہم اور قطورا کے زیر نگیں مختلف قبائل کی ایک وفاقیہ (Confederacy) قائم کی گئی (بحوالہ ابن ہشام صفحہ 72، ازراقی صفحہ 47- آغانی XIII، 108) تو تاریخی حوالوں کے مطابق شمالی راستے سے مکہ آنے والے جرہم سردار کو اور جنوبی طرف سے داخل ہونے والے قطورا سردار کو عشر ادا کرتے تھے مزید آگے چل کر جب قُصّی (پانچواں پشت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جدامجد) اور قبیلہ خزاعہ میں اقتدار کی کشمکش شروع ہوئی اور قریشیوں کو مکہ میں بالا دستی حاصل ہوئی تو آمدنی کا ایک اور ذریعہ سامنے آیا۔ قُصّی پہلے بازنطینی شہنشاہ (چوتھی صدی عیسوی) کا ہم عصر تھا۔ قصی نے محسوس کیا کہ اس کا خاندان نہ تو اتنا بڑا ہے اور نہ ہی اتنا طاقتور کہ عام عرب اس کی قیادت کو آسانی سے تسلیم کرلیں گے تو اس نے اپنے خاندان

والوں سے کہا کہ وہ اسے ایک فنڈ کے لیے رقم ادا کیا کریں جسے وہ غریب حاجیوں کو کھانا کھلانے اوران کے لیے سواری کا انتظام کرنے کے لیے استعمال کرے گا۔اس فنڈ کو رفادہ کہا جاتا تھا۔ یہ ٹیکس سالانہ ادا کیا جاتا تھا۔(بحوالہ ابن ہشام صفحہ 83،طبری صفحہ 1099، ابن سعد I/I صفحہ 41 یاقوت (مکہ) وغیرہ)۔شہری ریاست کی آمدنی کے کچھ دیگر ذرائع بھی تھے مثلاً کعبہ کے چڑھاووں کی آمدنی۔ اس کے علاوہ شہر میں معروف بتوں پر بھی چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے جو مقامی عربوں کے علاوہ دوسرے علاقوں سے آنے والے زائرین بھی چڑھاتے تھے۔ یہ رقم اموال المجر ہ کے نام سے جمع ہوتی تھی اور شہر کے دفاع سمیت دیگر ہنگامی ضروریات کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ چاہ زمزم کے نگران اور مقدس تیروں (فال وغیرہ کے لیے) کے شعبے کے نگران کو جو آمدنی ہوتی تھی وہ عموماً ان سرداروں کی ذاتی ملکیت میں چلی جاتی تھی۔ (کعبہ کے چڑھاوں کے لیے ملاحظہ ہو ابن عبدربہ ،العقد ، بولاق ،II صفحات 45-46)۔

مدینہ

قبل از اسلام مدینہ میں بدامنی کا دور دورہ تھا۔عرب اور یہودی اکثر برسرِ پیکار رہتے تھے اورانہوں نے کبھی کوئی مرکزی حکومت یا طاقت کا مرکز بنانے کی کوشش نہیں کی۔ تاہم یہودی قبیلہ بنی نضیر میں ایک مرکزی نظام مالیات موجود تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں شامی لکھتا ہے کہ کہ نضیریوں نے ایک خزانہ (کنز) قائم کیا ہوا تھا جس میں وہ تمام چندہ دیتے تھے اور یہ رقم ہنگامی حالات میں استعمال کی جاتی تھی اور یہ کہ جب وہ خیبر میں جا کر آباد ہو گئے اور جب مسلمانوں نے بعدازاں اس پر قبضہ کیا تو خزانہ کے انچارج نے جھوٹ بول دیا کہ تمام رقم استعمال ہوگئی ہے مگر یہ خزانہ بعد میں ایک خفیہ مقام سے برآمد کرلیا گیا جس پر انچارج کو سزا دی گئی اور رقم ضبط کر لی گئی۔ ان تفصیلات سے ہمیں زمانہ قبل از اسلام کے عرب کے نسبتاً ترقی یافتہ علاقوں کے حالات کے بارے میں قابلِ ذکر حد تک آگاہی حاصل ہوگئی ہے۔

اسلام کا ابتدائی دور

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ابتدا میں جب اسلام کی تبلیغ شروع ہوئی تو اسلام ریاست کا مذہب نہ تھا بلکہ اس کے برعکس اسے اپنی بقا کے لیے انتہائی نامساعد حالات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کے ماننے والوں کی تعداد میں گو تسلسل کے ساتھ دھیرے دھیرے اضافہ ہوا۔ اس کے باوجود پہلے تیرہ برسوں میں مٹھی بھر مسلمانوں کو اپنی مرضی سے زندگی گزارنے تک کی آزادی نہیں تھی۔ اپنے آپ کو منظم کرنے کی تو کوئی بات ہی نہ تھی۔ اسلامی تعلیمات کی بنیاد اخلاقیات کے اعلیٰ ترین معیار پر تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر و بیشتر اپنے پیروکاروں کو صدقات و خیرات کی ترغیب دیتے۔ قرآن کریم میں بھی بڑے واضح انداز میں خصوصاً مکی سورتوں میں بڑی کثرت سے زکوٰۃ (پاک کرنا، اضافہ کرنا گویا کہ آمدنی کا ایک حصہ خیرات کر کے اسے پاک کرنا) صدقہ (خیرات، سچائی، یعنی صدقہ ایک مومن کی سچائی کی دلیل ہے) حق (حق۔ یعنی اگر خیرات غریبوں کا حق ہے تو مالدار لوگوں پر اس کی ادائیگی فرض ہے) اور نفقہ (اخراجات۔ خصوصاً اللہ کی راہ میں) کا ذکر ملتا ہے جو بنیادی طور پر ایک ہی مفہوم کی علامت ہیں یعنی اپنے مال میں سے دوسروں کو دینا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ان مدات میں رقوم باضابطہ طور پر جمع کی اور تقسیم کی گئی ہوں۔ شاید ہر مسلمان خود ہی اپنے وسائل کے مطابق اپنی مرضی سے مستحق لوگوں اور مقاصد پر خرچ کر دیتا تھا اور اس وقت تک اس کی کوئی متعین شرح بھی نہ تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ابتدائی سورتوں میں مسلمانوں کو باور کرایا گیا ہے کہ پہلی امتوں یعنی یہودیوں اور مسیحیوں پر بھی صدقات و خیرات دینے کی پابندی ہوتی تھی۔

ہجرت کے بعد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی مکہ سے مدینہ ہجرت کے بعد حالات میں بنیادی تبدیلیاں آئیں۔ مدینہ میں باقاعدہ ایک ریاست کی بنیاد رکھی گئی۔ مسلمان اب اپنے معاملات میں آزاد تھے اور انہیں کسی طرف سے کوئی خوف نہ تھا۔ قرآن مال کو بقا کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ ایک ذریعہ جو انسانی زندگی کی بقا کے لیے ناگزیر ہے۔

"جس مال کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری گزران کا ذریعہ بنایا ہے" (5/4) اور حیرت کی بات نہیں اگر قرآن میں جگہ جگہ اس تاکید کو دہرایا گیا ہے کہ "نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو" اس طرح اسلام نے نماز اور زکوٰۃ کا ایک ساتھ ذکر کے بتا دیا ہے کہ اس کی نظر میں دونوں کی اہمیت برابر ہے گویا کہ روحانی اور مادی عبادات کے امتزاج سے مذہب کے ایک پہلو کی تکمیل کی گئی ہے۔

مدینہ میں جو ریاست قائم کی گئی وہ کسی سابقہ حکومت یا ریاست کا تسلسل نہ تھا کہ کسی نئے خاندان کا دور بادشاہی شروع ہو گیا بلکہ یہ ایک انقلاب، ایک ارتقاء کا آغاز تھا۔ قبائلی نظام سے ایک اعلیٰ معاشرتی نظام کی طرف سفر کی ابتدا جس نے ایک شہری ریاست سے ایک عظیم سلطنت کی شکل میں ڈھلنا تھا۔ فطری بات تھی کہ ہر چیز نئے سرے سے بنائی جاتی تھی اوپر سے نیچے تک کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کو ورثے میں کوئی حکومتی روایات ملی تھیں نہ انتظامی ادارے۔

جہاں تک نظم و نسق کے مالیاتی پہلو کا تعلق ہے اس میں تدریج کی حکمت اختیار کی گئی۔ ترغیب اور تاکید سے شروع کر کے اسے فرض اور لازمی قرار دینے کے سفر میں ضرورت پڑنے پر ریاستی طاقت بھی استعمال کی گئی۔ مدینہ میں تشریف آوری کے بعد اپنے پہلے خطبے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جہنم کی آگ سے بچنے کے لیے کھجور کا ایک حصہ دینے سے گریز نہ کرو" (ابن ہشام، صفحہ 34)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولین ترجیحات میں مہاجرین مکہ کی بحالی اور آبادکاری کا کام تھا جو اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر مدینہ آ گئے تھے۔ یہ انتظام سادہ لیکن مؤثر اور قابل عمل تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجر خاندانوں کی تعداد کا اندازہ کیا اور پھر مالی طور پر آسودہ حال اہل مدینہ کا ایک اجلاس بلایا اور کہا کہ ہر مدنی خاندان کو ایک مکی خاندان کی کفالت اپنے ذمہ لینا چاہیے جسے مواخات کا نام دیا گیا۔ اس میں پابند کیا گیا کہ دونوں خاندانوں کے لوگ اکٹھا کمائیں گے اور سب کا حصہ ہوگا اور وہ صلبی ورثا کی بجائے ایک دوسرے کی وراثت سے بھی حصہ پائیں گے۔ یہ ہنگامی نوعیت کا ایک حکم تھا اور اس میں مرضی اور خواہش سے علیحدگی کی بھی اجازت تھی۔

اس کے بعد صدقات و خیرات کی وصولی اور تقسیم کا ایک باضابطہ نظام عمل میں آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود مال وصول فرماتے اور تقسیم کرتے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ صدقات و خیرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رشتہ داروں کے لیے حرام کر دیئے گئے اور اس طرح عوامی امانتوں کے غلط استعمال کی ترغیب کا راستہ بند کر دیا گیا۔ تیسرے مرحلے پر زکوٰۃ و خیرات کو باقاعدہ ایک ریاستی ٹیکس کی شکل دینا تھا۔ اس کی حتمی تاریخ کا تعین تو شاید کرنا ممکن نہ ہو تاہم یہ 8 ہجری (629ء) سے قبل کی بات ہے کیونکہ ایک ایسی دستاویز موجود ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور نئے مسلمان ہونے والے قبیلے اسلم کے مابین معاہدے پر مشتمل ہے جس میں نماز کے قیام اور زکوٰۃ کی وصولی کا نظام قائم کرنے کی شق موجود ہے جبکہ اس میں انہیں اپنے آبائی گھر چھوڑ کر اسلامی ریاست کی حدود میں آباد ہونے کی پابندی سے مستثنیٰ کیا گیا ہے (الوثائق السیاسیة نمبر 165)۔ یاد رہے کہ فتح مکہ کے موقع پر بھی عرب قبائل پر اپنے گھروں کو چھوڑ کر اسلامی ریاست کی حدود میں آ کر آباد ہونے کی شرط ختم کر دی گئی تھی۔ غالباً اس وقت تک زکوٰۃ خود لوگ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا کرتے تھے کیونکہ ایسے شواہد نہیں ملتے کہ اس مقصد کے لیے سرکاری اہلکار مقرر کیے گئے ہوں۔ یہ چوتھے اور آخری مرحلہ میں ہوا کہ ملک بھر میں ٹیکس وصول کنندگان مقرر کیے گئے اور انہیں مختلف ٹیکسوں کی شرح سے متعلق ہدایات دی گئیں۔

زکوٰۃ اور صدقات کی حیثیت

مذکورہ بالا تفصیلات سے عیاں ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریاست کے قیام کے بعد بھی زکوٰۃ، حق اور صدقہ کی اصطلاحات تبدیل نہیں کیں حالانکہ اس حوالے سے ان کے معانی میں کافی فرق آ چکا تھا۔ مکہ میں ان کی حیثیت صرف خیرات تھی مگر مدینہ میں ان کی حیثیت باقاعدہ سرکاری ٹیکس کی ہو چکی تھی اور انہیں نماز اور روزہ جتنی اہمیت ہی حاصل تھی۔ نفقہ یا انفاق کی حیثیت مدینہ میں بھی وہی رہی جو مکہ میں تھی جو رضاکارانہ خیرات کے ہم معنی تھی جو کسی شخص کی مرضی اور مالی حیثیت کے مطابق ہو سکتی تھی

اور جس کے بدلے میں آخرت میں اللہ تعالیٰ کے انعامات کا وعدہ تھا مگر نہ کرنے کی صورت میں اس دنیا یا آخرت میں سزا کی وعید بھی نہ تھی۔ اسلام میں ٹیکسیشن کی حقیقی نوعیت کے بہتر ادراک کے لیے ضروری ہے کہ یہ نکتہ ذہن میں رہے کہ عملی مقاصد کے لیے زکوٰۃ، حق اور صدقہ کو ہم معنی ہی سمجھا جانا چاہیے کہ یہ روحانی اور مادی مقاصد کے حامل سرکاری ٹیکس ہیں۔ حقیقت میں یہ اصطلاحات مسلمانوں سے حاصل ہونے والی آمدنی پر لاگو ہوتی ہیں کیونکہ غیر مسلموں سے خراج اور مال غنیمت کی شکل میں جو وصولی ہوتی تھی وہ زکوٰۃ میں شامل نہیں کی جاتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں زکوٰۃ اور صدقہ، نہ صرف نقد رقم پر وصول کیا جاتا تھا بلکہ زرعی اراضی اور گھریلو جانوروں (بکری، بھیڑ، اونٹ اور گائے) پر بھی ٹیکس نافذ تھا۔ اسی طرح شہد کے چھتوں، معدنی کانوں (خصوصاً سونا اور چاندی اور لوہے کی)، سونے اور دوسری قیمتی اشیاء پر بھی ٹیکس کی ادائیگی لازمی تھی۔ بہت زیادہ تفصیلات میں جائے اور تحقیق پر مغز ماری کے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں زکوٰۃ اور صدقہ ہی ریاستی آمدنی کا بڑا ذریعہ تھے اور یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اس دور میں جن اشیاء پر ٹیکس نافذ تھا اور جس شرح سے وصول کیا جاتا تھا آنے والے وقت اور حالات میں انہیں تبدیل نہیں کیا جا سکتا اور مسلمان فقہاء نے اسے تسلیم بھی کیا ہے۔
حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں مدینہ میں درآمد کی جانے والی اشیائے صرف پر ڈیوٹی 10 سے کم کر کے 5 فیصد کر دی تھی (ابو عبید، 1660) (حالانکہ سابقہ ڈیوٹی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نافذ فرمائی تھی۔ مترجم)

ٹیکسوں کی شرح

قرآن کریم میں مسلمانوں کی ملکیتی اشیاء پر ٹیکس کی شرح کی کوئی وضاحت موجود نہیں جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اس حوالے سے اسلامی قانون میں لچک رکھی گئی ہے۔ 1400 سال پہلے کا عرب ایک بنجر اور بے آباد زمین کا ملک تھا جہاں سے انتہائی کم پیداوار حاصل ہوتی تھی۔ زرعی پیداوار پر عشر نافذ تھا مگر یہ اسی صورت میں قابل الوصول تھا

جب پیداوار چھوٹ دی گئی مقدار سے بڑھ جاتی تھی۔ کھجوروں اور انگوروں کے باغات اور دیگر پھلدار درختوں کے علاوہ گندم اور جو کی فصل پر ٹیکس کیش کی بجائے جنس کی شکل میں وصول کیا جاتا تھا۔ جبکہ گھریلو جانوروں پر اندازاً ایک فیصد سالانہ ٹیکس عائد تھا بشرطیکہ یہ جانور عام چراگاہوں پر پلتے ہوں اور ان کی تعداد چھوٹ دی گئی کم از کم تعداد سے زیادہ ہو۔ نقد رقم، سونا اور چاندی پر ٹیکس کی شرح اڑھائی فیصد سالانہ تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ ٹیکس آمدنی نہیں بچت پر تھا۔ ایسی بچت جو ایک سال تک مالک کے پاس فالتو پڑی رہے اس پر مالک مرکزی حکومت یا اس کے ایجنٹوں کو ٹیکس ادا کرنے کا پابند تھا۔ تجارت میں ٹیکس کاروبار میں اشیاء کے سٹاک پر لگتا تھا۔ قرض بھی شمار کیا جاتا تھا اور اتنی قدر رقم بچت یا سٹاک سے منہا کر کے باقی رقم یا سٹاک پر ٹیکس عائد کیا جاتا تھا۔ کانوں سے برآمد ہونے والے مال پر بھی **10** فیصد عشر لاگو ہوتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں یہ آمدنی کا ایک معروف ذریعہ تھا۔ ان کے علاوہ آمدنی کے بعض دوسرے ذرائع بھی تھے جیسا کہ بیرونی تاجروں پر درآمدی ڈیوٹی لگتی تھی۔ مدینہ میں بیرونی تجارت کوئی نئی چیز نہیں تھی اور نبطی تاجر گندم، تیل اور زیتون دوسرے ممالک سے مدینہ لایا کرتے تھے۔ فوجی خدمات سے مستثنیٰ قرار پانے والے بھی ایک ٹیکس ادا کرنے کے پابند تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ارد گرد کی آبادیوں کے مابین ہونے والے مختلف معاہدے بھی آمدنی کا ذریعہ تھے۔

قومی آمدنی کے اخراجات کے بارے میں قرآنی احکام

ریاستی آمدنی (یا سرکاری خزانہ) سے اخراجات کے بارے میں قرآن **(61/9)** نے واضح احکام دیئے ہیں اور اسے ریاستی حکام کے رحم و کرم یا مرضی پر نہیں چھوڑا گیا۔ قرآن کہتا ہے ''صدقات (مسلمانوں سے حاصل ہونے والی آمدنی) مسلمان غربا (فقرا) اور غیر مسلم غریب شہری (مساکین)، ٹیکس انتظامیہ کے اہلکاروں، (اسلام کے فروغ کیلئے) لوگوں کے دل جیتنے اور ہمدردیاں حاصل کرنے، غلام آزاد کرانے، اور جنگی قیدی چھڑانے، قرض کے بوجھ تلے دبنے والوں کی مدد کے لیے، اللہ کی راہ کے لیے اور

مسافروں کے لیے (خرچ کیئے جاسکتے) ہیں۔ یہ فرض ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔''

یہاں ایک چھوٹی سی وضاحت بے جانہ ہوگی۔ فقرا یا مسلمان غربا کی تو وضاحت کی ضرورت نہیں البتہ یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسی بلند قامت شخصیت کی یہ گواہی موجود ہے کہ مساکین سے مراد اسلامی ریاست کے غیر مسلم غریب شہری ہیں۔ سامی روایات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے مثلاً حمورابی کے مشہور قوانین میں ہمیں ایک اصطلاح مشکینا نظر آتی ہے جس سے مراد ہے غیر ملکی شہری جو بہت حد تک بعد کے اسلامی قانون کے لفظ ذمی کے ہم معنی ہے۔ جن اہلکاروں کی تنخواہیں اور اخراجات اس مد سے ادا کیئے جاتے ہیں ان میں نہ صرف ٹیکس جمع کرنے والے بلکہ اکاؤنٹ، آڈٹ اور تقسیم کرنے والے ملازمین بھی شامل ہیں۔ اخراجات کی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تقریباً تمام انتظامیہ کے اخراجات اسی مد سے ادا ہوتے تھے۔ بلاذری اپنی کتاب ''انساب'' جلد اول صفحہ 585 میں حوالہ دیتے ہیں کہ خلیفہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک بار گورنر شام سے کہا تھا کہ حکومتی حسابات درست کرنے کے لیے کچھ رومی ماہرین کو مدینہ بھجوایا جائے یقینی طور پر یہ ماہرین غیر مسلم ہوں گے اور یقیناً انہیں تنخواہیں بھی ادا کی جاتی ہوں گی۔ جہاں تک ''وہ لوگ جن کے دل جیتے جانے ہیں'' (مولف القلوب) سے مراد لوگوں کا تعلق ہے تو انہیں چار درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے درجے میں وہ لوگ آتے ہیں جن کی ہمدردیاں حاصل کر کے انہیں مسلمانوں کی مدد پر آمادہ کیا جاسکتا ہو۔ دوسرے درجے پر وہ لوگ ہیں جن کے دل جیت کر انہیں مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے باز رکھنا مقصود ہو۔ تیسرے درجے میں جو لوگ اسطرح خود اسلام لانے کی طرف مائل کیئے جاسکتے ہوں۔ چوتھے درجے میں ان لوگوں کا دل جیتنا مقصود ہو کہ جن کے اسلام لانے سے ان کے اہل خاندان اور قبیلے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیں۔ اس لیے ان چاروں درجوں میں آنے والے لوگوں کو خواہ وہ مسلم ہوں یا مشرک زکوٰۃ سے رقوم دی جاسکتی ہیں (ابو یعلیٰ - الاحکام السلطانیہ صفحہ 116)۔ آج کے دور میں سیکرٹ سروس پر ہونے والے اخراجات کو اس مد پر منطبق کیا جاسکتا ہے۔ یہ حقیقت کہ

حکومت کو سالانہ بجٹ میں غلاموں کی آزادی اور دشمن کے قبضے سے جنگی قیدی (مسلمان اور غیر مسلم) چھڑوانے کے لیے باقاعدہ رقم مختص کرنا پڑتی تھی اتنی واضح ہے کہ مزید محتاج وضاحت نہیں۔ اسلام میں غلامی کا تصور دراصل غلام کے مفاد میں ہے نہ کہ سرمایہ داروں کے ہاتھوں اس کے استحصال کے لیے۔ غلام عام طور پر جنگی قیدی کی حیثیت سے آتے تھے جن کے پاس نہ گھربار ہوتا نہ اہل خاندان۔ اسلامی ریاست میں غلاموں کو گھر اور روزی کی ضمانت تھی۔ ایک مسلم ریاست کی نہ صرف یہ ذمہ داری ہے کہ وہ غلاموں کو خرید کر آزاد کرے بلکہ ایک غلام کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ کما کر اپنی قیمت مالک کو ادا کر کے آزادی حاصل کر سکتا ہے اور مالک اس سے انکار کا مجاز نہیں (قرآن کریم: **33/24**) بشرطیکہ عدالت اس بات پر مطمئن ہو جائے کہ غلام کی کافی اصلاح ہو چکی ہے اور آزاد کر دینے کی صورت میں وہ ریاست کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔

''قرضہ کے بھاری بوجھ تلے دبے ہوئے'' شخص کو (بحالی کے لیے) ریاستی نگرانی میں سود سے پاک قرضہ دے کر ملک سے سود کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ (یہ مقصد لوگوں کی تمام جائز ضروریات پوری کر کے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے) جیسا کہ ''غلاموں کی آزادی'' والی شق سے بتدریج غلامی کا خاتمہ ہو گیا۔ ''اللہ کی راہ کے لیے'' ایک وسیع المعانی اصطلاح ہے جس میں قومی فوج سے لے کر طالب علموں کی مدد کے لیے دی گئی رقوم تک کے اخراجات شامل ہیں۔ ''مسافروں کے لیے'' سے مراد نہ صرف (نادار یا پھنس جانے والے) مسافروں کے لیے کرایہ اور رہائش کے اخراجات شامل ہیں بلکہ سیاحوں کے لیے ہوٹل، ریستوران اور ذرائع آمد و رفت، سڑکوں پر حفاظتی انتظامات کو بہتر بنانا اور اسی طرح کے دوسرے اخراجات بھی جائز ہیں۔

اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں عرب کے عام حالات کا تصور کریں تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ مندرجہ بالا مدات پر اخراجات سے نوزائیدہ ریاست کے تمام وسائل صرف ہو جاتے ہوں گے۔ ہمسایہ سلطنتوں روم اور ایران میں جو کچھ عام شہریوں کے لیے کیا جاتا تھا اسلامی ریاست اس سے بہت آگے تھی مگر درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فلاحی ریاست قائم کی تھی۔ اگر ہم اس نظام کی روح کو دیکھیں تو یہ نتیجہ اخذ

کرنے میں ذرہ برابر دشواری نہیں ہوتی کہ اسلامی قانون مالیات میں ہر دور اور ہر تہذیب کے تقاضوں پر پورا اترنے کی صلاحیت اور گنجائش موجود ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے بجٹ

اسلامی ریاست جس کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی جس کے حاکم اور نگران تھے کی حدود میں مسلسل توسیع ہو رہی تھی۔ ریاست جس کا آغاز پہلی صدی ہجری سے ہوا مدینہ کی چند گلیوں پر مشتمل تھی مگر چند سال بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے داعی اجل کو لبیک کہا تو پورے عرب کے علاوہ جنوبی فلسطین اور عراق کے بہت سے علاقے اسلامی ریاست کا حصہ بن چکے تھے۔ یہ تقریباً 10 لاکھ مربع میل علاقہ بنتا ہے اور یہ سب کچھ صرف دس سال کے مختصر عرصے کا ثمر تھا گویا کہ اس دوران 274 مربع میل رقبہ روزانہ اسلامی ریاست میں شامل ہوتا رہا۔ اس طرح ریاست کی آمدنی میں بھی سال بہ سال بلکہ روزمرہ کی بنیاد پر اسی حساب سے کمی بیشی ہوتی رہی۔ اس لیے کسی ایک سال کا ٹھیک ٹھیک حساب کتاب لگانا ممکن نہیں تاہم متفرق اعداد و شمار دیئے جاسکتے ہیں۔

بحرین کی آمدنی (اس سے مراد آج کا بحرین نہیں بلکہ بحرین کے بالمقابل واقع علاقہ الاحسا) =80 ہزار درہم (یاقوت، معجم البلدان، بحرین) اہل خیبر نے اپنی زرعی پیداوار نصف، نصف تقسیم کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی اس سے اسلامی ریاست کو سالانہ 20 ہزار وسق کھجوریں اور گندم حاصل ہوتی تھی (ابن ابی شیبہ تذکرہ حاشیہ ابوعبید کی "اموال" 1437، 1587، 1590) فلسطین کے علاقے (جربہ اور اذرح) سوسو دینار سالانہ ادا کرتے تھے (ابن سعد وغیرہ)۔

خلیج عقبہ کی بندرگاہ ایلہ 300 دینار سالانہ ادا کرتی تھی (ابن سعد، مقریزی، "امتاع" 468، 1)۔

یمن میں نجران کے علاقہ سے ہر سال 2000 پارچہ جات موصول ہوتے تھے اور ہر پارچہ کی مالیت ایک اونس سونے کے برابر تھی (دیکھئے الخراج از ابو یوسف صفحہ 41) اس

علاقہ میں کپڑا بنانے کی صنعت مستحکم تھی اور غیر مسلم عیسائی آبادی کی اکثریت تھی۔ خلیج عقبہ پر واقع بندرگاہ مقنہ اپنی کھجور اور مچھلی کی پیداوار کا ایک چوتھائی دینے کی پابند تھی۔ اسی طرح جو عورتیں گھریلو سطح پر دھاگہ بنتی تھیں ان کا ایک چوتھائی بھی انہیں دینا پڑتا تھا۔ (ابن سعد، I/II، صفحہ 48) تاہم حقیقی آمدنی کتنی تھی اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ یہی معاملہ فدک اور وادی القریٰ کا تھا جہاں کاشتکاروں کو پیداوار کا نصف حصہ دینا پڑتا تھا مگر یہاں بھی حقیقی آمدنی کا تعین دشوار نظر آتا ہے۔ ان کے علاوہ بعض (زیر نگین) علاقے رقبہ اور وسائل کے حوالے سے بڑے تھے اور اسی قدر ان سے وصولی بھی تھی۔

جہاں تک اخراجات کا تعلق ہے یہاں ایک یہودی قبیلے بنو عرید کی مثال دی جانی مناسب ہے۔ ایک دستاویز میں جس کا حوالہ ابن سعد، اور دوسروں نے دیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دس وسق گندم، دس وسق جو ہر فصل کے موقع پر اور 50 وسق کھجوریں ہر سال دیا کرتے تھے۔

بعد کے ادوار

اسلامی ریاست کی آمدنی اور اخراجات کی تفصیلات حاصل کرنا یقیناً ایک مہم سے کم نہیں۔ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد کے ڈھیروں سے اس موضوع کی مناسبت سے نکات چننا اور اخذ کرنا بڑا تحقیق طلب کام ہے۔ اگر تمام محقق اپنے نتائج کو تحریری شکل میں لے آئیں تو ان اعداد و شمار کی بنیاد پر ایک بہتر تصویر حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ بعد کے ادوار خصوصاً عباسی خلافت کے آمدنی اور اخراجات کے حسابات بڑی حد تک محفوظ ہیں اور شائع بھی ہو چکے ہیں۔ مثلاً جرمن محقق وان کریمر نے اس حوالے سے کافی کام کیا ہے مگر اس کی کتابوں میں بیشتر جگہ آمدنی کا تذکرہ ملتا ہے مگر یہ تفصیلات اس حوالے سے دلچسپ ہیں کہ ہمیں اس دور کے یورپ کے بارے میں ذرا سی بھی معلومات دستیاب نہیں مثلاً شارلمین کی سلطنت کے بارے میں، جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید اور اس نے باہم سفیروں کا تبادلہ کر رکھا تھا۔ بعد کے ادوار میں مختلف خلفاء کے بجٹوں کے تقابلی مطالعہ سے اس افسانے کی حقیقت بھی کھل جاتی ہے کہ حضرت عمر بن

عبدالعزیز کے دور میں اصلاحات اور کئی ٹیکسوں کے خاتمے سے مالیاتی بحران پیدا ہو گیا تھا (620ء) صرف صوبہ عراق کی آمدنی کی تفصیلات اس جھوٹے پراپیگنڈہ کی نفی کے لیے کافی ہیں۔

دور خلافت	آمدنی (درہم میں)
خلیفہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (644ء)	12 کروڑ
ابن زیاد حضرت معاویہ کے نامزد گورنر (680ء)	10 کروڑ
حجاج بن یوسف۔اموی خلیفہ عبدالملک کے گورنر (705ء)	ایک کروڑ 80 لاکھ
عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ (717ء)	12 کروڑ
ابن ہبیرہ (720ء)	10 کروڑ
یوسف بن عمر	6 سے 7 کروڑ

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دور خلافت کس قدر مختصر تھا اور اگر انہیں کچھ دیر مزید خلافت پر فائز رہنے کا موقع ملتا تو وہ یقیناً تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیتے۔

وان کریمر نے صوبہ عراق کے یہ اعداد و شمار دے کر نا قابل فہم طور پر خود اپنے اخذ کردہ نتائج کی نفی کرتے ہوئے لکھا ہے ''تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ خلیفہ عمر ثانی (717ء) نے اپنے غیر حکیمانہ احکامات اور پالیسیوں سے خزانہ کو سخت نقصان پہنچایا (Culturgeschichte, I, 262) کیا فارسی ضرب المثل ''دروغ گو را حافظہ نہ باشد'' وان کریمر کے ذہن کی صحیح عکاسی نہیں کرتی ؟

VIII

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت سیاسی مدبر

(ذمیوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حُسن سلوک کے اثرات)

بہتر یہ ہے کہ ہم آخری حصہ سے شروع کر کے پہلے ان اثرات و نتائج کو نظر میں لائیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حوالے سے پالیسیوں سے مرتب اور حاصل ہوئے اور پھر تحقیق و جستجو سے ان عوامل کا کھوج لگائیں جنہوں نے ان نتائج کے حصول کو ممکن بنایا۔

معروف روسی مستشرق بارتھولڈ رقم طراز ہے کہ (بحوالہ اسکی کتاب ''مسلمان کلچر'' کا انگریزی ترجمہ صفحہ 22) ''روسی مذہبی مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ صلیبی جنگوں کے دوران مذہبی پیشواؤں سمیت عام لوگوں کی خواہش تھی کہ رومنوں (کیتھولک عیسائی) کی حکمرانی سے کہیں بہتر ہے کہ مسلمانوں کا دورِ حکومت لوٹ آئے۔''

ایک برطانوی مؤرخ اے۔ ایل۔ میکاک (A.L. Maycock) (پاپائیت Papacy-صفحہ 48) دو صدیوں بعد جب ترک ان کے شہر قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) میں داخل ہوئے تو اہل شہر چلا اُٹھے کہ ''وہ پوپ کے تاج پر مسلمان سلطان (ترک) کی پگڑی کو ترجیح دیتے ہیں''۔

یہ بعد کے زمانوں کے حقائق دراصل (غیر مسلم رعایا سے) اس حسن سلوک کے آئینہ دار تھے جو آغاز سے ہی مسلمانوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلیفہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو سب سے پہلا سرکاری حکم جاری کیا وہ ایک لشکر کی ملک شام کی طرف روانگی تھی جس کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی

حیات مبارکہ میں دیا تھا (لشکر اُسامہؓ) اس لشکر کے بھیجنے کا مقصد اپنے ایک سفیر کے قتل کا بدلہ لینا تھا جبکہ ہرقل نے قاتلوں کو سزا اور اس کا خون بہا ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مسلمان فوج نے اچانک حملہ کر کے مملکت فلسطین میں قیصر روم کے ایک بڑے فوجی مرکز پر قبضہ کر لیا۔ دریں اثنا حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک باعزت امن معاہدہ کے لیے ایک سفارت قسطنطنیہ بھیجی مگر یہ کوشش بے سود رہی۔ آیئے اس حوالے سے ہم مشہور مؤرخ (KARALEVSKI کی رائے دیکھتے ہیں جو انہوں نے اپنی کتاب DICTIONNAIRE DE l'HISTORY ET DE GEOGRAPHIE ECCELSISTIQUES میں اپنے ایک مضمون میں لکھی۔ وہ کہتے ہیں (Vol:3, Column 592, 594)

> ''یہودیوں نے عربوں کا استقبال (حملہ آوروں کی حیثیت سے نہیں) نجات دہندوں کی حیثیت سے کیا .... جس اقدام پر یہودیوں نے سب سے زیادہ اظہارِ مسرت کیا وہ ہر طبقہ کو اندرونی خودمختاری دینا تھا جس میں سزا اور فیصلوں کے بہت سے اختیارات ان کے مذہبی پیشواؤں کو دیئے گئے تھے۔''

اس دور کے بارے میں بات کرتے ہوئے ممتاز ڈچ مستشرق ڈی گوجے (اپنی کتاب Memoire Sur La Conquete de La Syrie, 2nd Edition, Pages: 104, 106) کہتے ہیں:

> ''سلطنت شام میں لوگوں کے دل عربوں کی طرف مائل تھے وہ اس کے مستحق بھی تھے کیونکہ انہوں نے مفتوحہ شہریوں سے جس حسن سلوک کا مظاہرہ کیا وہ سابقہ رومی آقاؤں کے ظالمانہ طرزِ عمل کے بالکل برعکس تھا۔ بعض مسیحی طبقوں نے CHALCEDON کلیسا کو تسلیم نہیں کیا تھا جس کی پاداش میں ہرقل نے ان کے ناک اور کان کاٹ دینے کا حکم دیا تھا اور ان کے گھر بھی منہدم کر دیئے گئے۔''

اسی طرح جن یہودیوں پر ایرانی حملہ آوروں کی حمایت کا الزام تھا ان پر بے پناہ مظالم

ڈھائے گئے حالانکہ ہرقل نے معافی کا وعدہ کیا تھا (EUTRYENIUS, II, 242, 246) اس کے برعکس عربوں نے اپنے خلیفہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہدایت کی روشنی میں مفتوحین کے دل جیتنے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے یہ کہ انہوں نے جو وعدے کیے ان کی کامل پابندی کی............... کم وبیش پندرہ برس ایک نسطوری پادری (میسحون کے ایک مخصوص فرقے کے پیروکار) نے اپنے ایک دوست کو لکھا:

> ''یہ طائی (عرب) جنہیں اللہ نے اب ہم پر حاکمیت عطا کی ہے اور جو ہمارے آقا بنے ہیں، ہمارے مذہب سے ہرگز تعرض نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس وہ عقیدے کا تحفظ کرتے ہیں۔ ہمارے مذہبی پیشواؤں اور اکابر کا احترام کرتے ہیں اور گرجوں اور خانقاہوں کو فیاضانہ تحائف سے بھی نوازتے ہیں۔''

پس منظر:

یہ سب اس پالیسی اور طرز عمل کا اعجاز تھا جس کا حکم قرآن پاک نے دیا ہے۔ قرآن پاک (47/5) کا فرمان ہے ''اور انجیل والوں کو اپنے فیصلے اسی طرح کرنے چاہئیں جس طرح اللہ نے انجیل میں نازل فرمایا ہے''۔ اس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی قلمرو میں جس کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بانی اور حاکم تھے، یہودیوں، مسیحوں سمیت تمام مذاہب کے ماننے والوں کو (اندرونی معاملات میں) مکمل خودمختاری عطا کی تھی۔ پہلی صدی ہجری میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں پہلی شہری مملکت قائم کی جب کہ اس سے قبل یہاں بدنظمی اور شورش کا دور دورہ تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا آئین بھی (تیار اور) نافذ فرمایا جو تاریخ عالم میں پہلا تحریری دستور ہے۔ اس کی شق 25 یہ تھی ''یہودی اپنے دین کے پیروکار رہیں اور مسلمان اپنے دین پر کاربند رہیں۔''

یہ فیاضانہ پالیسی محض مذہب اور عقائد تک محدود نہ تھی بلکہ عام سماجی زندگی میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقہ تھا اگر کسی تنازع کے فریق یہودی ہوتے تو عدالت بھی یہودی ہوتی، جج بھی یہودی ہی ہوتے اور قانون بھی یہودی (عقائد پر مبنی) ہوتا تھا۔

اور اپیل کے لیے بھی مسلم کورٹ سے رجوع نہیں ہوسکتا تھا۔ تاہم اگر فریق ملے جلے ہوتے تو باہمی رضا مندی سے عدالت کا انتخاب کر لیتے اور اگر اتفاق ہو جاتا تو مسلمان عدالت میں مقدمہ لے آتے اور مسلم قوانین کا اطلاق صرف اس صورت میں ہوسکتا تھا اگر تمام فریق رضا مند ہوتے۔

مسلمانوں نے کبھی اپنی غیر مسلم رعایا پر اپنے قوانین ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ کس قدر خوشگوار حقیقت ہے کہ اسرائیل میں آج جو شخصی حیثیت کا قانون (Law of Personal Status) رائج ہے وہ وہی قانون ہے جو دور عثمانیہ میں یہودیوں کیلیے (بحیثیت غیر مسلم رعایا) تیار کیا گیا تھا (یقیناً یہودی اکابرین کی مدد سے) اور اسرائیلی مذہب پسندوں نے اس میں کسی قسم کی خرابی یا کمی نہیں پائی۔

مسلمانوں نے ہندوستان پر ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ حکومت کی اور ہندوؤں کو معلوم ہے کہ ان پر مسلم نہیں بلکہ ہندو قوانین کا اطلاق ہوتا تھا۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں کشمکش شروع ہوئی اور نوبت جنگ تک پہنچ گئی تو کہا جاتا ہے کہ رومی شہنشاہ کانسٹنٹائن نے مسلم مملکت کے عیسائیوں کو خفیہ ایلچی بھیج کر بغاوت پر اکسایا اور یقین دلایا کہ اگر آپ لوگ بغاوت کر دیں تو شہنشاہ کی فوج بھی حملہ کر کے اسے منطقی انجام تک پہنچانے میں مدد کرے گی۔ مگر ان عیسائیوں نے جو کہ ان رومی حکمرانوں کی سابق رعایا تھے جواب دیا کہ وہ مسلمانوں کو ان پر ترجیح دیتے ہیں۔ کیا جدید سیاست دان اپنے مفاد میں اس بات پر غور و فکر کریں گے کہ ملک میں نام نہاد اقلیتوں کے ساتھ کیسے برتاؤ کیا جائے؟

IX

جنگ جمل اور صفین کے پس پردہ یہودی ہاتھ

نہ تو مکہ میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش تھی اور نہ ہی مدینہ میں جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعدازاں اپنا وطن بنایا کوئی ریاست یا بادشاہت تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم 569ء میں اس دنیا میں تشریف لائے اور 609 میں اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب نبوت پر فائز فرمایا۔ بعدازاں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ آپ کو ایک ریاست کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اپنے ہم وطنوں کی سختیوں سے تنگ آ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت فرمائی۔ امکانات بہت روشن نہیں تھے مشرکین مکہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی اپنی سازش کی ناکامی اور بچ نکلنے کے بعد مدینہ میں بحفاظت تشریف آوری پر پیچ و تاب کھا رہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں بھی چین سے رہنے نہیں دے رہے تھے۔ انہوں نے اہل مدینہ کو مسلسل دھمکی آمیز پیغام بھجوائے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں، یا شہر سے نکال دیں ورنہ وہ خود کارروائی کریں گے (سنن ابو داؤد 19 / 23۔ بنو نضیر۔ ابن حبیب کی کتاب المحبر صفحہ 271-4)۔

وہ شخصیت جسے اللہ تعالیٰ نے 'پیروی کا شاندار نمونہ' (قرآن 33 / 21) بنا کر بھیجا تھا اسے (ان ریشہ دوانیوں کا) جواب تو دینا تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے تو ان سینکڑوں مکی مہاجرین کی بحالی کی طرف توجہ کی جو عملی طور پر تن کے کپڑوں کے سوا کچھ بھی ساتھ نہ لا سکے تھے۔ یہ مسئلہ بہت جلد اور مستقل بنیادوں پر مواخات کے معروف عمل کے ذریعے حل ہو گیا اور ہر مہاجر خاندان کو ایک آسودہ حال مدنی خاندان کے ساتھ شریک کر دیا گیا (ابن ہشام۔ سیرۃ صفحہ 344-5۔ یورپی ایڈیشن)۔

اگلا قدم: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے خطے میں آباد تمام قبائل کے نمائندوں کا ایک اجلاس بلایا جس میں مہاجرین مکہ، انصار مدینہ، غیر مسلم عرب، عیسائی اور یہودی بھی شریک ہوئے۔ (بخاری 96/16/18 کے مطابق یہ اجلاس انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن مالک کے والدین کے گھر میں ہوا)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجلاس میں ایک مرکزی تنظیم کے ساتھ ایک کنفیڈرل سٹی سٹیٹ بنانے کی تجویز پیش کی۔ یہودیوں سمیت شرکاء کی اکثریت نے تجویز قبول کر لی اور مختلف وجوہ کی بنا پر غیر مسلموں نے یہ بھی مان لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس نئی ریاست کے سربراہ ہوں گے۔ چنانچہ مرکز اور اس کا حصہ بننے والے یونٹوں کے حقوق کا تعین کر دیا گیا اور ذمہ داریاں بھی تفویض کر دی گئیں اور یہ سب کچھ احاطۂ تحریر میں لے آیا گیا (بحوالہ میری کتاب The First Written Constitution in the World) ان خوش کن تبدیلیوں سے حوصلہ پا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے گردونواح میں واقع قبائلی آبادیوں کے دورے کیے اور انہیں ایک فوجی اتحاد بنانے کی تجویز پیش کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بتایا کہ "اگر آپ پر حملہ ہوا تو ہم آپ کی مدد کو آئیں گے اور اگر ہم پر حملہ ہوا اور ہم نے آپ کو بلوایا تو آپ کو بھی آنا ہوگا۔ اس معاہدے میں مذہبی اختلافات کو ایک طرف رکھ دیا گیا۔ ان معاہدوں میں سے بعض کے متن اور مندرجات ہم تک پہنچے ہیں (بحوالہ ابن سعد، ii/1، صفحہ 24، 26، 27)۔ یہ معاہدے مدینہ سے شمال، جنوب اور مغرب میں آباد قبائل سے کیے گئے۔

جب یہ "منڈلہ" (ہندو سیاسی فلاسفروں کا یہ نام اس صورتحال کے لیے بہت موزوں ہے یعنی اپنے اور دشمن کے درمیان دوست قوموں کا ایک سلسلہ وجود میں لے آنا) حقیقت بن گیا تو گویا مشرکین مکہ سے انتقام لینے اور سزا دینے کا وقت آ گیا جنہوں نے بہت سے مسلمان مردوں، عورتوں حتیٰ کہ بچوں کو بھی محض اسلام لانے کی پاداش میں قتل کر دیا تھا اور انہیں مالی نقصان پہنچایا تھا۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سزا کے پُرامن طریقہ کو ترجیح دی اور انہیں معاشی مار مارنے کا فیصلہ کیا اور حکم دیدیا کہ قریش کے شمال (مصر، شام، عراق) کو جانے والے تجارتی قافلوں پر مدینہ اور اس کے اتحادی قبائل کے

پاس سے گزرنے والے راستے بند کر دیئے جائیں۔ اہل مکہ نے بزور طاقت قافلے گزارنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں جنگ بدر ہوئی اور اس کے بعد احد اور خندق کی جنگوں کی نوبت آئی (بحوالہ میری کتاب **Battlefields of the Prophet Muhammad)**

جب اہل مکہ کی تمام امیدیں ختم ہو گئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''سیاسی حملہ'' کرنے کا فیصلہ کیا۔ مکہ کے علاقے میں قحط پھوٹ پڑا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے زیر اثر علاقے نجد سے مکہ کے لئے رسد پر عائد پابندی ختم کر دی اور غریب لوگوں کی مدد کے لئے سونے کی **500** اشرفیاں بھی بھجوائیں۔ شمال کے ممالک سے کٹ جانے کے بعد اہل مکہ کا تجارتی سامان ان کے گوداموں میں پڑا سڑنے لگا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان کا مال کھجوروں کے تبادلے میں خریدنے کی پیشکش کی (ان تمام واقعات کا حوالہ المبسوط (از سرخسی) **X** ، **92،91** اور شرح السیر الکبیر **I**، **70**، ابوعبید کی کتاب الاموال پیرا **631** میں موجود ہے۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حرام مہینوں میں مکہ (حدیبیہ) تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد معاہدہ امن کرنا تھا۔ چونکہ ابوسفیان اس معاہدے کے وقت مکہ میں نہیں تھا اس لئے یہ قیاس بھی کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے خفیہ طور پر اپنا تجارتی قافلہ لے کر شام جانے اور اس مقصد کے لئے اہل مکہ کے لئے ممنوع قرار دیا جانے والا مدینہ کا راستہ اختیار کرنے کی اجازت دی تھی۔ جنگ خندق میں یہودیوں کی طرف سے بھرپور امداد ملنے کے باوجود اہل مکہ نے حدیبیہ امن معاہدے کے تحت مسلمانوں کی کسی تیسری طاقت سے جنگ کی صورت میں غیر جانبدار رہنا تسلیم کر لیا (اور اسی کے نتیجے میں مسلمان خیبر پر حملہ کرنے اور اسے ختم کرنے میں کامیاب ہوئے جو یہودیوں کی طاقت کا ایک بڑا مرکز تھا)۔

مکہ کی کہانی مکمل کرنے سے پہلے چند جملوں میں یہودیوں کی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاصمت کا تذکرہ۔ مسلمانوں کی طرف سے خیر سگالی اور دوستی کے مظاہرے کے باوجود یہودی قبیلہ بنو نضیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کی۔ انہوں

نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہہ کر دعوت دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین اصحاب کے ہمراہ آئیں اور ہمارے مذہبی اکابرین سے گفت وشنید کریں اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قائل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہم اسلام قبول کرلیں گے۔ ایک یہودی کی عرب بیوی نے اس سازش سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو باخبر کر دیا۔ اس سازش کی پاداش میں بنونضیر کو مدینہ سے نکال دیا گیا (مصنف از عبدالرزاق نمبر 7933- سمہودی (Samhudi) صفحہ 298) اور یہ یہودی ہی تھے جنہوں نے خیبر میں بیٹھ کر جنگ خندق کی راہ ہموار کی خیبر کی فتح سے فوجی اور سیاسی خطرے کا تو قلع قمع کر دیا گیا لیکن یہودیوں کی نفرت ختم نہ کی جا سکی جو نسل در نسل چلی آ رہی ہے۔

صلح حدیبیہ دو سال تک قائم رہی۔ اس کی خلاف ورزی اہل مکہ کی طرف سے ہوئی اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جنگی فراست سے خون بہائے بغیر مکہ پر قبضہ کرلیا۔ قبضہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کے لئے جس عام معافی کا اعلان کیا وہ ان کے لئے قطعی غیر متوقع اور اتنی بروقت تھی کہ ان کے دل اسلام کی طرف مائل ہو گئے اور کم وبیش ایک ہی رات میں تمام اہل مکہ نے اسلام قبول کرلیا۔ اس سے پورے عرب میں بت پرستی کے تعصّبات کا خاتمہ ہو گیا اور تمام لوگ اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ دس سال قبل جو اسلامی ریاست مدینہ کے چھوٹے سے قصبے کے ایک حصے میں قائم ہوئی تھی اب اس کی حدود عرب سے نکل کر فلسطین اور عراق کے جنوبی حصوں تک پہنچ رہی تھیں اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قلمرو کی حدود 30 لاکھ مربع کلومیٹر سے تجاوز کر چکی تھیں اور اسلام کے جانثاروں کی تعداد پانچ لاکھ سے بڑھ گئی تھی۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اپنی سیاسی مصروفیات کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے روحانی مشن سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف سربراہوں کو خطوط روانہ فرمائے جن میں انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیروں میں سے ایک کو رومی علاقے میں قتل کر دیا گیا اور جب رومی بادشاہ نے خون بہا دینے سے انکار کیا تو رومیوں کے ساتھ لڑائی شروع ہو گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت

دارالحکومت مدینہ میں اس بات پر تو تمام مسلمانوں کا اتفاق تھا کہ اسلامی ریاست کو جو اتنی تکالیف کے بعد قائم ہوئی تھی برقرار رکھا جائے تاہم اس بارے میں ان میں اختلاف تھا کہ رسول اللہ کا جانشین کون ہو۔ اس وقت تین رجحانات سامنے آرہے تھے۔

(1) انصار مدینہ کی خواہش تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت اہل خزرج کو ملنی چاہیے جب کہ اوس قبیلہ اس کی مخالفت کر رہا تھا۔

(2) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان بنو ہاشم خاندانی حکمرانی کے حق میں تھا اور ان کی خواہش تھی کہ خلیفہ بنو ہاشم سے ہونا چاہیے۔

(3) عامتہ المسلمین کی اکثریت کسی اہل ترین شخص کو منتخب کرنے کے حق میں تھی۔

مشہور شاعر حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر جو اشعار کہے ان میں بیرونی سازش کا بھی واضح تذکرہ ملتا ہے۔

یثرب (مدینہ) کے عیسائی اور یہودی خوش ہوئے جب دفن ہونے والے کو قبر میں اترا گیا (انساب از بلاذری، 1، 593) ابو الہیثم کی شاعری میں بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔

> عیسائی بُرے کلمات منہ سے نکال رہے ہیں اور منافق بھی۔ وہ ایک ہی رسی کے ٹکڑے ہیں اور یہودی بھی ان تینوں قوموں کے لوگ ہمارے خلاف مورچہ بند ہیں ان کے ہاتھ میں تیر ہیں اور وہ آگے بڑھ رہے ہیں۔ (کتاب الردا ۔ پیرا3)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان الائمۃ من القریش (حکمران قریش سے ہی ہوں گے) جو بڑے نازک وقت میں ایک انصاری نے یاد دلایا لوگوں کے دل میں اتر گیا اور انصار مدینہ نے خلافت کے اپنے دعویٰ سے بہ رضا و رغبت دستبرداری اختیار کر لی اور موقع پر موجود سب لوگوں نے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرضی کے خلاف ان کے کندھوں پر خلافت کا بار گراں لاد دیا۔ (کتاب الردا ۔ واقدی)۔ اس کے باوجود تین روز تک ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہرکارے مدینہ میں منادی کرتے رہے کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے آپ بیعت کرنے کی پابندی سے آزاد ہیں آپ کسی اور کو یہ ذمہ داری سونپ

دیں (انساب از بلاذری ا صفحہ 587)۔

اس قسم کے بے لوث شخص سے کون خلافت کا زیادہ مستحق ہوگا۔ ایک اور معروف حقیقت بھی ہے جسے اہل تشیع اور اہل سنت دونوں تسلیم کرتے ہیں مگر اس کے اثرات و مضمرات پر لگتا ہے اب تک کسی نے غور نہیں کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتخاب کے بعد حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے دادا چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہمراہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملنے تشریف لے گئیں اور مطالبہ کیا کہ نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ورثہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ورثا میں تقسیم کیا جائے بلکہ باغ فدک اکیلے انہیں دیا جائے۔ کیا حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے شوہر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دادا چچا عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرضی کے بغیر جا سکتی تھیں؟ اگر وہ خود ان کے شوہر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دادا چچا عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ تسلیم نہ کرتے تو بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کیوں اپنا دعویٰ لے کر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جاتیں۔ وہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قانونی حکمران تسلیم کر کے جائیداد کی تقسیم کا معاملہ ان کے پاس لے گئیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ دعویٰ لے کر بھی جا سکتی تھیں کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عہدہ خلافت سے ان کے شوہر کے حق میں دستبردار ہو جائیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ''ظاہری'' جانشین بھی تھے۔

ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مختصر دور حکومت گوناگوں مسائل سے بھرپور تھا۔ مثلاً فتنہ ارتداد، منکرین زکوٰۃ وغیرہ اس کے علاوہ قرآن پاک کو کتابی شکل میں جمع کرنے کا عظیم کام، رومیوں اور ساسانیوں سے لڑائیاں۔ اپنے انتقال سے قبل آپ نے اپنا جانشین نامزد کر دیا اور درج ذیل انداز میں ان کا نام عام مسلمانوں کے سامنے پیش کیا تاکہ ان کی توثیق حاصل کی جا سکے۔

انہوں نے عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عفان کو بطور سیکرٹری بلوایا اور اپنی وصیت لکھوائی جس کے الفاظ یہ تھے: ''یہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے اس دنیاوی زندگی کے آخری دن اور اخروی زندگی کے پہلے دن جب ایک کافر ایمان لے آتا اور بدکار یقین کر لیتا ہے دستاویز ہے کہ میں نے اپنے بعد........ ...... یہاں تک پہنچ کر ان پر کمزوری

اور بیماری کی شدت سے غشی طاری ہو گئی اور ممکنہ خدشات کو محسوس کرتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی طرف سے لکھ دیا۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا خلیفہ نامزد کیا ہے''۔ دریں اثناء ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوش میں آ گئے اور انہوں نے عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ وصیت کہاں تک پہنچی تھی۔ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پورا جملہ پڑھ دیا ''میں اپنے بعد آپ کے لئے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن خطاب کو خلیفہ نامزد کرتا ہوں''۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سن کر کہا ''لیکن میں نے نام تو نہیں لکھوایا تھا۔ آپ اپنا نام بھی لکھ سکتے تھے اور آپ اس کے اہل بھی ہیں۔ بہرحال اللہ تمہاری نیکی، خیر خواہی اور دیانت داری پر تمہارے اوپر اپنی رحمت نازل کرے۔'' پھر آپ نے وصیت مکمل کروائی (مکمل متن کے لئے ملاحظہ ہو سنن از بیہقی VIII، 149، انساب از بلاذری II، 486، مسودات استنبول، میری کتاب وثائق السیاسیہ نمبر 392 / ڈی)۔

اس کے بعد ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ''پولیس کمشنر'' کو ہدائت کی کہ وہ اسے باہر لے جائیں اور مسلمانوں کو جمع کر کے انہیں بتائیں کہ یہ آپ کے خلیفہ کی نامزدگی کی وصیت ہے اور ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ پیغام ہے کہ آپ سب اس نام کی توثیق کر دیں جو اس بند لفافے میں لکھا ہے۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر لوگوں کو اس قدر اعتماد تھا کہ سب لوگوں نے بلا تامل اسے قبول کر لیا۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتقال کے بعد سربمہر لفافہ کھولا گیا اور پھر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے بیعت کی تجدید کی گئی۔ تقریباً بارہ برس بعد ایک غلط فہمی کی بنا پر انہیں شہید کر دیا گیا۔ جان، جان آفریں کے سپرد کرنے سے قبل عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک کمشن مقرر کر دیا اور انہیں ہدائت کی کہ ان سب سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں۔ یہ تمام عشرہ مبشرہ میں سے تھے (دس اصحاب جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں ہی جنت کی بشارت دی تھی)۔ ان میں سے دو کا پہلے انتقال ہو چکا تھا اور ایک خود عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بستر مرگ پر تھے۔ باقی سات میں سے ایک کو جوان کے قریبی رشتہ دار تھے انہوں نے فہرست سے خارج کر دیا۔ پھر اس خیال سے کہ چھ کے انتخاب میں ووٹ برابر برابر ہو سکتے ہیں انہوں نے ساتویں رکن کا اضافہ کر دیا لیکن اسے صرف ووٹ دینے کا اختیار تھا وہ خود خلیفہ نہیں بن سکتا تھا تاہم اس پر پابندی تھی کہ وہ

صرف اس وقت ووٹ دیں اگر ووٹ برابر برابر ہو جائیں اور اس طرف ووٹ دیں جس طرف عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عوف ہوں۔ عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عوف پر اس غیر معمولی اعتماد کی وجہ غالباً ایک واقعہ ہے کہ جب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قاتلانہ حملے میں زخمی ہوئے تو انہیں عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عوف کے گھر لے جایا گیا اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس خدشہ کے پیش نظر کہ کہیں عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہیں خلافت کے لئے نامزد نہ کر دیں۔ جونہی وہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے آئے تو سلام کے بعد فوراً بول اٹھے ''نہیں نہیں مجھے نامزد نہ کرنا میں خلافت کا خواہش مند نہیں''۔
عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتقال کے بعد جب کمشن کا اجلاس ہوا تو عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عوف نے تجویز کیا کہ جو امیدوار نہیں ہیں ان کا اعلان کر دیا جائے چنانچہ (چار کی دستبرداری کے بعد) صرف عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ رہ گئے جس پر عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عوف نے تجویز کیا کہ وہ دونوں کسی ایک پر اتفاق کر لیں۔ دونوں نے ذمہ داری عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عوف کے کندھوں پر ڈال دی۔ انہوں نے ذاتی رائے دینے کی بجائے عامۃ المسلمین سے مشورہ کیا۔ ابن کثیر کے الفاظ میں (بدایہ VII، 146) ''انہوں نے لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی رائے لینا شروع کی خفیہ طریقے سے بھی اور ظاہری بھی۔ وہ گھروں میں بھی گئے اور عورتوں سے بھی رائے لی۔ انہوں نے مدارس کے طالب علموں سے بھی پوچھا۔ حتیٰ کہ مدینہ میں ٹھہرے ہوئے مسافروں اور بدوؤں سے بھی دریافت کیا۔ اس ساری مہم جوئی میں ان پر منکشف ہوا کہ صرف دو افراد عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ (بن یاسر) اور مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ (بن اسود) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حمائت کر رہے ہیں جبکہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں ہے۔ تین روز مسلسل مشوروں کے بعد عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے مسلمانوں کو جمع ہونے کیلئے کہا۔ پہلے انہوں نے عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے باری باری پوچھا اگر میں آپ کو نامزد نہ کروں تو آپ دوسرے کی اطاعت کا وعدہ کرتے ہیں۔ دونوں نے ہاں میں جواب دیا۔ پھر سب کے سامنے انہوں نے باری باری دونوں سے پوچھا: اگر میں آپ کو منتخب کروں تو کیا آپ قرآن، حدیث اور اپنے

پیشروں ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایات کی پابندی کریں گے۔
عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جواب ہاں میں تھا تاہم علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ "قرآن اور سنت، ہاں مگر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایات کی پابندی کو میں ضروری نہیں سمجھتا۔ میں خود قانون وضع کرسکتا ہوں۔"

اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عوف نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا اور کہا "باری تعالیٰ تو جانتا ہے میری سوائے اس کے کوئی دلچسپی نہیں کہ میں امت مسلمہ کی بہتری اور فلاح کو عزیز رکھتا ہوں اور پھر انہوں نے خود حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت کی جس کی دوسروں نے تقلید کی۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور اسلام اور مسلمانوں کے لئے غیر معمولی خوشحالی اور آسودگی کا دور تھا۔ 27 ہجری میں ان کی افواج ایک طرف سپین کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں تو دوسری طرف ماوراء النہر پر کمندیں ڈال رہی تھیں (طبری، بلاذری)۔ ان کے تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ وہ سرکاری خزانہ سے کوئی تنخواہ قبول نہیں کرتے تھے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اتنا کچھ دیا ہے کہ انہیں بیت المال سے کچھ لینے کی حاجت ہی نہیں۔ ان کے جود و سخا کا چرچا چار سو تھا۔

طبری کی روایت ہے کہ 33-35 ہجری کے برسوں میں ایک یمنی یہودی عبداللہ بن سبا نے جو ابن السودا کے نام سے مشہور تھا اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے ظاہری تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ نماز فجر کے لئے مسجد میں داخل ہونے والا وہ پہلا شخص ہوتا اور نماز عشاء کے بعد مسجد سے رخصت ہونے والا بھی وہ آخری شخص ہوتا۔ ہر وقت نوافل کی ادائیگی میں مصروف رہتا۔ اکثر روزہ رکھتا اور ورد و وظائف کا تو شمار ہی نہ تھا۔ اس کے بعد وہ عالم اسلام کے دورے پر نکل کھڑا ہوا اور حجاز، بصرہ، کوفہ، شام، مصر میں لوگوں کو اپنے بناوٹی تقویٰ سے متاثر کرتا اور خصوصاً ان لوگوں کی ٹوہ میں رہتا جنہوں نے موقع پرستی کے لئے اسلام کا لیبل اپنے اوپر لگا لیا تھا لیکن دراصل وہ اس کی جڑیں کاٹنے کے درپے تھے۔
جب اس نے ایسے بہت سے افراد جمع کر لئے تو اپنا منصوبہ ان کے سامنے پیش کیا جو سادہ مگر دُور رس اثرات کا حامل تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو ہدائت کہ وہ اس کے سگنل کے

منتظر رہیں۔اس نے ایک خط تیار کیا جو ہر علاقے میں اس کے معتمدین خاص کو دوسرے علاقوں کے معتمدین خاص کی طرف سے پہنچایا گیا۔اس میں لکھا تھا" پیارے بھائی۔آپ خوش قسمت ہیں آپ کے علاقے میں اسلام زندہ ہے۔گورنر دیانت دار ہے، انتظامیہ منصف مزاج ہے جبکہ میرے علاقے میں اسلام مردہ ہو چکا ہے کوئی شخص اس پر عمل پیرا نہیں۔گورنر شرابی اور عورتوں کا رسیا ہے۔انتظامیہ بدعنوان ہے۔بہتری کا کوئی امکان نہیں اس طرح کے خطوط مسلسل مدینہ سے ہر شہر میں آئے اور اسکے معتمدین نے نمازوں کے بعد مساجد میں پڑھ کر سنائے اور اسی طرح ہر شہر سے ایسے ہی خطوط مدینہ میں آئے۔پہلے پہل تو لوگوں نے کوئی توجہ نہ دی لیکن جب "حالات" کی "مسلسل تصدیق" ہونے لگی تو عوام میں ناراضگی پھیلنے لگی۔بعض نے یہ اطلاعات خلیفہ (عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ) تک بھی پہنچائیں۔اپنے معمول کے مطابق انہوں نے فوراً کارروائی کی اور لوگوں سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے۔فیصلہ ہوا کہ مدینہ سے با اعتماد اور غیر جانبدار لوگوں کو ان علاقوں کے دورے پر بھیجا جائے جہاں کے بارے میں شکائت کی گئی ہے کہ وہ اسلام سے دُور ہو گئے ہیں اور یہ لوگ خود مشاہدہ کر کے الزامات کی تحقیقات کریں۔بظاہر یہ لوگ گروپوں کی شکل میں نہیں گئے بلکہ ہر ایک اپنے لئے مقرر علاقے کی طرف گیا۔طبری کے مطابق تمام نمائندے اپنے مقررہ وقت پر واپس دارالحکومت پہنچ گئے اور یہی خبر لائے کہ نامعلوم افراد کی طرف سے عائد کئے جانے والے الزامات بے بنیاد ہیں اور حالات بہت اچھے اور معمول کے مطابق ہیں (تاہم بدقسمتی سے صوبوں میں اس قسم کا کوئی انتظام نہ کیا گیا جہاں لوگ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف پھیلائی جانے والی بے بنیاد کہانیوں پر مسلسل یقین کرتے رہے)۔

صرف مصر جانے والے عمار رضی اللہ عنہ ابن یاسر واپس نہ آئے اور مصر میں ہی ٹھہر گئے۔کچھ ہی عرصہ بعد گورنر مصر نے خلیفہ کو رپورٹ بھجوائی کہ یہاں کچھ لوگوں نے عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو چکر دیکر ساتھ ملا لیا ہے اور ان کے ساتھ جمع ہو رہے ہیں جن میں عبداللہ بن السودا بھی شامل ہے۔خلیفہ نے رواداری کا مظاہرہ کیا۔طبری نے لکھا ہے کہ "شوال 35 ہجری میں ابن سبا نے مصر سے مدینہ کا سفر اختیار کیا۔اس کے 600 کے لگ بھگ فدائی

اس کے ساتھ تھے۔ اپنے آپ کو ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا رکھنے کے لئے انہوں نے اعلان کیا کہ وہ حج کے لئے جا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی بصرہ اور کوفہ سے بھی سبائی مدینہ کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ بلاشبہ یہ سب یہودی النسل نہیں تھے ان میں سے بعض مخلص مسلمان بھی تھے جو اپنی سادگی کے باعث ان کے ہتھے چڑھ گئے تھے سبائی پراپیگنڈہ کام دکھا رہا تھا اور ان سب کا یہ مطالبہ تھا کہ خلیفہ کو معزول کیا جائے جو تمام برائیوں کی جڑ ہے لیکن ان میں یہ اتفاق رائے نہیں ہو رہا تھا کہ خلیفہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معزول کر کے کسے ان کی جگہ لایا جائے۔ مصریوں کا مطالبہ تھا کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا جائے۔ بصرہ کے سبائی طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں تھے جبکہ کوفی زبیر رضی اللہ عنہ بن عوام کے حامی تھے۔ عامۃ المسلمین کی حمائت حاصل کرنے کے لئے زمین بڑی احتیاط سے ہموار کی گئی۔ جو خطوط مدینہ سے بھجوائے ان پر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دستخط کئے گئے تھے جن میں مصریوں سے کہا گیا تھا کہ وہ مدینہ آئیں اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلافت کی گدی سے اتارنے میں ان کی مدد کریں (طبری)۔ دوسرے خطوط پر بی بی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دستخط تھے جن میں صوبوں کے لوگوں کو عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف بغاوت پر اکسایا گیا تھا۔ (ابن سعد III، i صفحہ 574) جبکہ بعض خطوط پر طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دستخط کئے گئے (ابن کثیر III، 175)۔

جب شام اور فلسطین کے گورنر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مشکوک افراد کے قافلوں کی مختلف مقامات سے مدینہ روانگی کی اطلاعات ملیں تو انہوں نے خلیفہ کو مطلع کرتے ہوئے استدعا کی کہ انہیں اپنے کچھ قابل اعتماد فوجی دستے دارالحکومت بھجوانے کی اجازت دے دیں مگر خلیفہ نے یہ پیشکش قبول نہ کی۔

جب مصر، بصرہ اور کوفہ سے آنے والے باغی مدینہ پہنچے تو وہ سیدھے اپنے ''محبوب'' لیڈروں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے۔ انہوں نے امہات المومنین کے پاس بھی حاضری دی۔ ان تمام نے آنے والوں سے یہی سوال کیا کہ وہ اچانک ان پر کس طرح اتنے مہربان ہو گئے ہیں۔ انہوں نے خلافت کی پیشکشیں بھی ٹھکرا دیں اور انہیں اپنے گھروں سے نکال باہر کیا۔ (ادھر سے

مایوس ہونے کے بعد) مصری باغی خلیفہ کے پاس چلے گئے اور گورنر کے خلاف شکائت پیش کی۔ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا آپ لوگ اس کی جگہ کس کو گورنر لانا چاہتے ہیں؟ ''ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے محمد کو''۔ باغیوں نے جواب دیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مدینہ میں ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ان صاحبزادے کو اچھے لفظوں میں یاد نہیں کیا جاتا تھا بلکہ انہیں فاسق کہا جاتا تھا اور بی بی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کھلے لفظوں میں ان کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کرتی تھیں۔

عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فوری طور پر باغیوں کا مطالبہ تسلیم کرلیا اور نئے گورنر کی تقرری کا خط لکھ کر محمد کے حوالے کیا اور انہیں ہدائت کی کہ وہ فوراً مصر پہنچیں۔ باغیوں کو ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ ان کا یہ مطالبہ اتنی آسانی سے تسلیم کرلیا جائے گا۔ اب ان کے لئے مصر واپسی کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا۔ پھر اس بدنام کہانی کا آغاز ہوا کہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خفیہ طور پر ایک ایلچی مصر بھیجا جس میں گورنر کو مبینہ طور پر ہدائت کی گئی تھی کہ نئے نامزد گورنر محمد جونہی مصر پہنچیں انہیں قتل کر دیا جائے۔ طبری، ابن حجرا، زوائد، مسند البزار، مسودات پیر جھنڈو پاکستان، **المطالب العالیہ** ایڈیشن کویت پیرا **4438**، ابن العربی، **عواسم من القواسم** صفحہ **96** پر جو تفصیلات بیان کی ہیں انہیں پڑھ کر قاری خود ہی اندازہ کرسکتا ہے کہ حقائق کیا تھے۔

مصری دستہ نے مطمئن ہو کر واپسی کا سفر اختیار کیا۔ نامزد گورنر محمد بھی ان کے ہمراہ تھے۔ راستے میں ایک تیز رفتار اونٹ سوار ان کے پاس سے گزر کر آگے گیا اس کا رخ مصر کی جانب تھا۔ ابھی وہ راستے میں ہی تھے کہ وہی اونٹ سوار واپس مدینہ کی طرف جاتا نظر آیا۔ اور ایک بار پھر دیکھا گیا کہ وہی اونٹ سوار دوبارہ مصر کی جانب عازم سفر ہے۔ مگر کسی نے اس سے تعرض نہ کیا مگر اچانک اس نے قافلہ والوں پر دشنام طرازی شروع کر دی۔ انہوں نے پوچھا ''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟'' اس نے بڑے متکبرانہ انداز میں جواب دیا ''میں خلیفہ کا قاصد ہوں اور گورنر مصر کے لئے ان کا خط لے کر جا رہا ہوں''۔ اور خط اُنہیں دکھا بھی دیا۔ متجسس ہو کر محمد نے وہ خط کھول لیا اور پڑھا جس میں مبینہ طور پر گورنر مصر کو ہدائت کی گئی تھی کہ جونہی نامزد گورنر محمد اپنا تقرر نامہ لے کر آپ کے پاس پہنچیں

انہیں قتل کر دیا جائے اور ان کے ساتھیوں کو دیگر سزائیں دی جائیں۔

کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ یہ خط بھی ابن سبا کی ایک اور جعلسازی تھی؟ سازشیوں کی توقع کے عین مطابق خط پڑھ کر محمد برافروختہ ہو گئے۔ انہوں نے فی الفور مدینہ واپسی کا سفر اختیار کیا اور دارالحکومت پہنچ کر طوفان کھڑا کر دیا اور اگرچہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قسم اٹھا کر انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ خط انہوں نے نہیں لکھا مگر محمد نہ مانے۔

مصری باغی پھر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پہنچے اور مطالبہ کیا کہ خلیفہ کے قتل کے لئے ان کا ساتھ دیں جنہوں نے بلاوجہ ہمارے قتل کا حکم دیا۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا آپ ہمیں کس طرح انکار کر سکتے ہیں آپ نے ہی تو خط لکھ کر ہمیں بلوایا ہے۔ انہوں نے کہا ''خدا کی قسم میں نے کبھی کوئی ایسا خط نہیں لکھا''۔ باغی حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ایک دوسری روائت کے مطابق علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ''تم مصر کے راستے سے عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک جعلی خط کا بہانہ بنا کر واپس آ گئے ہو مگر بصرہ اور کوفہ والے دستے جو اپنے اپنے ملکوں کو روانہ ہو چکے تھے وہ بھی تمہارے ساتھ ہی مدینہ واپس پہنچ چکے ہیں انہیں کیسے معلوم ہوا کہ آپ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ یقیناً یہ سازش کا شاخسانہ ہے''۔ (طبری)

حج کا زمانہ قریب آ رہا تھا خلیفہ نے مدینہ گریژن کے فوجی دستوں کو حج پر جانے کی اجازت دیدی اور مدینہ امن وامان قائم رکھنے والی فوج سے خالی ہو گیا۔ باغیوں نے خلیفہ کی رہائش گاہ کا محاصرہ کر لیا اور انہیں مسجد نبوی میں نمازیوں کی امامت سے روک دیا۔ غفقی نامی ایک یمنی نے جو ابن سبا کا نائب تھا خلیفہ کی بجائے نمازوں کی امامت شروع کر دی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ابن سبا کی طرح وہ بھی یہودی تھا کیونکہ شہادت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد اس نے اس قرآن کو پاؤں سے ٹھوکر ماری جسے شہادت کے وقت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پڑھ رہے تھے اور یہ الٹ کر خلیفہ کے گھٹنوں پر گر پڑا۔

باغیوں نے خلیفہ کی رہائش گاہ کا گیٹ جلا دیا تاہم وہ اندر نہ جا سکے۔ اس پر حملہ

آور محمد (بن ابوبکرؓ) کے ہمراہ پیچھے کی گلی سے ہو کر مکان کی عقبی دیوار پر چڑھ گئے اور اندر کود کر قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے خلیفہ کو شہید کر ڈالا۔ انکی اہلیہ شوہر کو بچانے کی کوشش میں شدید زخمی ہو گئیں۔ ان کے ہاتھ کی انگلیاں بھی کٹ گئیں۔ باغیوں نے گھر میں لوٹ مار بھی کی۔ حملہ سے قبل محمد نے معمر خلیفہ کی داڑھی پکڑ لی جب خلیفہ نے انہیں شرم دلائی کہ ''اگر آپ کے والد (ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) یہاں ہوتے اور آپ کو اس حالت میں دیکھتے ......'' تو انہوں نے داڑھی چھوڑ دی اور واپس چلے گئے تاہم دوسروں نے اپنا کام مکمل کر دیا۔ شومئ قسمت دیکھئے کہ باغیوں نے خلیفہ کے جسد خاکی کو جنت البقیع میں دفن کرنے سے بھی روک دیا اور کہا کہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہودی ہیں (استغفر اللہ) اور یہ حقیقت ہے کہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جس قطعہ اراضی پر دفن کیا گیا وہ ایک یہودی کی ملکیت تھی بعد میں جب معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بنے تو انہوں نے وہ قطعہ اراضی جس میں معصوم خلیفہ کی قبر تھی خرید کر جنت البقیع میں شامل کر دیا۔

جنگ جیت لینا اور ایک شریف النفس بے دست و پا خلیفہ کو قتل کرنا تو آسان تھا مگر اب امن و امان کیسے بحال ہو؟ باغی اب چاہتے تھے کہ اپنے جرم کا کوئی جواز پیدا کر لیں تاکہ انصاف کے کٹہرے میں کھڑے ہونے سے بچ سکیں۔ پہلے وہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے اور انہیں خلافت کی پیشکش کی مگر انہوں نے انہیں جھڑک کر واپس بھیج دیا جس کے بعد وہ طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور پھر زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے لیکن انہوں نے بھی انہیں منہ نہ لگایا۔ پھر انہوں نے ایک اور حربہ اختیار کیا کہ مدینہ کی گلیوں میں اعلان کرنے لگے کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کہو کہ وہ خلافت سنبھال لیں ورنہ ہم تمہارا قتل عام شروع کر دیں گے۔ اس کے نتائج خاطر خواہ نکلے۔ لوگ روتے پیٹتے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے اور استدعا کی کہ انہیں ہتھے سے اکھڑے ہوئے باغیوں کی دستبرد سے بچائیں۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کی آہ و فغاں سے متاثر ہوئے مگر کہا کہ خلافت عوام الناس کا معاملہ ہے میں نہ تو آپ کے کہنے پر اور نہ ہی باغیوں کے کہنے پر اسے سنبھال سکتا ہوں۔ یہ بات تو درست ہے کہ خلیفہ کی ضرورت ہے مگر اس کے لئے لوگوں کی رائے لینا ہو گی اس لئے میں کل نماز فجر کے بعد لوگوں سے اس بارے میں پوچھوں گا۔

اگلے روز نماز کے بعد علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر کھڑے ہوکر اور بے گناہ خلیفہ کے بہیمانہ قتل پر دلی دکھ اور صدمے کا اظہار کرنے کے بعد کہا کہ آپ کسی کو خلیفہ منتخب کر لیں۔ شاید سب سے پہلے چیخنے والے سبائی ایجنٹ ہی ہوں جنہوں نے کہا ''صرف آپ ہی اس کے مستحق ہیں، کیونکہ آپ سب سے اچھے مسلمان ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ کہنے والے سچے مسلمان ہی ہوں تاہم اس موقع پر کوئی اور نام سامنے نہ آیا اور لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت کرنا شروع کر دی۔ باغیوں نے دیکھا کہ بعض ممتاز اصحاب رضی اللہ عنہم اس موقع پہ خاموش رہے اور انہوں نے کسی قسم کی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ان میں زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ثابت، ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ شامل تھے۔ باغیوں کو سب سے زیادہ خدشہ طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تھا۔ اس لئے وہ ان دونوں کو بہ نوک شمشیر مسجد میں لائے اور دھمکی دی کہ اگر انہوں نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت نہ کی تو وہ انہیں قتل کر دیں گے۔ جب باغیوں نے دیکھا کہ دوسرے لوگ لاتعلق اور مصالحانہ رویہ اپنائے ہوئے ہیں تو انہوں نے سوچا کہ ان سے بعد میں بیعت لے لیں گے چنانچہ طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جبر اور دباؤ کے تحت بیعت کی۔

عام لوگوں کو توقع تھی کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلافت کا آغاز ہی قاتلین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گرفتاری سے کریں گے مگر دن اور ہفتے گزرنے لگے اور ایسا کچھ بھی نہ ہوا (مدینہ کا کنٹرول عملی طور پر باغیوں کے ہاتھ میں تھا اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ باغیوں کی مرضی کے بغیر کچھ بھی کرنے کے قابل نہ تھے۔)

اب مدینہ سے ایک اور خط پورے عالم اسلام میں پھیلایا گیا جس میں کہا گیا کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلیفہ بننے کے لئے عثمان رضی اللہ تعالیٰ کو قتل کرایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قاتلین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ آہستہ آہستہ لوگوں کو اس الزام پر یقین آنے لگا۔ یہ فطری بات تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ اور بچوں کو ہر شخص سے زیادہ دلچسپی تھی کہ قاتلین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف نظام انصاف کو

حرکت میں لایا جائے اس لئے (شاید مدینہ سے مایوس ہو کر۔ مترجم) آپ کی اہلیہ نے اپنی کٹی ہوئی انگلیاں اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ کا خون آلود کرتہ جو وہ بوقت شہادت زیب تن کیے ہوئے تھے معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ گورنر شام کو بھجوا دیا جو عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قریبی رشتہ دار تھے اور ان پر زور دیا کہ قتل عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقام لیا جائے۔ میرا ذاتی اندازہ ہے کہ سبائیوں نے شام سے خطوط علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی بھجوائے ہوں گے جن میں انہیں بھڑکایا گیا ہوگا کہ معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی خلافت کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں بلکہ راہ اسلام سے بھی ہٹ گئے ہیں۔ اس قسم کے خطوط جب ایک تسلسل اور منصوبہ بندی کے ساتھ آئیں تو اپنا اثر ضرور دکھاتے ہیں۔ اس موقع پر اپنے مخلص دوستوں کے مشوروں کو نظر انداز کر کے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک سیاسی غلطی کا ارتکاب کیا۔ انہوں نے معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سمیت صوبائی گورنروں کو شہادت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سانحہ کی اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ وہ خلیفہ کا منصب سنبھال چکے ہیں اور اب وہ نہ صرف خود نئے خلیفہ کی بیعت کریں بلکہ اپنے صوبوں میں بھی خلیفہ کے لئے بیعت لیں۔ انہوں نے معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام خط میں انہیں گورنر کے منصب سے معزول کرتے ہوئے ہدائت کی کہ وہ چارج نئے گورنر کے حوالے کر دیں۔

یقینی طور پر سبائیوں نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی لیکن وہ آسانی سے ان کے چکر میں آنے والے نہ تھے۔ انہوں نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خط کا جواب نہایت نرمی سے دیا اور کہا کہ جب قاتلین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گرفتار کر کے سزا دے دی جائیگی وہ بیعت کر لیں گے۔

اب ہم اپنے موضوع کی طرف واپس آتے ہیں۔ اسی اثناء میں سبائیوں کی طرف سے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور دوسری ازواج مطہرات کو خطوط بھجوائے گئے جن میں الزام لگایا گیا کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سزا دینے سے انکاری ہیں اور امہات المومنین رضی اللہ عنھن ہونے کی حیثیت سے آپ کا یہ حق اور فرض ہے کہ آپ اپنے "بچے" عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتلوں کے

سروں کا مطالبہ کریں۔ بصرہ سے آنے والے خطوط میں یہ پیشکش بھی کی گئی کہ اگر امہات المومنین رضی اللہ عنھن بصرہ آئیں تو وہ انہیں ہر ممکن مدد کے لئے حاضر پائیں گی۔

کچھ عرصہ بعد طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ جانے کے لئے مدینہ سے روانہ ہو گئے ان کی منزل بصرہ تھی۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ ان کی روانگی سے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خدشہ لاحق ہوا کہ اگر انہوں نے بصرہ کے خزانہ پر قبضہ کرلیا اور وہاں کی فوج ان سے مل گئی تو وہ حکومت کے لئے خطرہ بن جائیں گے اس لئے انہوں نے بھی عراق جانے کا قصد کرلیا۔ ادھر ام المومنین حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر ان کے بھائی ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلسل زور دے رہے تھے کہ وہ سیاست میں سرگرم حصہ لیں۔ اسی اثناء میں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی اپنے کچھ قریبی عزیزوں کے ہمراہ عراق تشریف لے گئیں۔ بصرہ کے نزدیک ام المومنین عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گرد جمع ہو جانیوالوں اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فوج میں تصادم کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

سبائیوں کی خطوط مہم سے بہت سی غلط فہمیاں جنم لے چکی تھیں۔ بعض مخلص اور غیر جانبدار مسلمانوں نے مصالحت کی کوششیں شروع کر دیں اور جلد ہی یہ کوششیں بارآور ثابت ہوئیں۔ حقیقت یہ تھی کہ نہ تو علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سزا دینے کے خلاف تھے اور نہ ہی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کوئی ذاتی عزائم تھے۔ امن معاہدہ ہو گیا اور دونوں طرف کے لوگ پہلی بار سکون کی نیند سو گئے۔ بظاہر ابن سبا کے کھیل کی بساط الٹ چکی تھی۔ مگر وہ حوصلہ ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ رات کے آخری پہر اس کے کچھ آدمی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے کیمپ میں داخل ہو گئے اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فوج پر حملہ کر دیا۔ قدرتی طور پر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کیمپ میں یہی سمجھا گیا کہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے کیمپ نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے اور دھوکہ سے حملہ کر دیا ہے۔ تاہم جلد ہی ان کے فوجیوں نے صورتحال پر قابو پالیا۔ ادھر عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے کیمپ کو گمان ہوا کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے خلاف ورزی کی گئی ہے۔ اس ساری صورتحال میں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے انتہائی جرأت مندی سے صورتحال کا مقابلہ کیا اور آخر تک اپنی اونٹنی پر سوار

رہیں۔ اسی بنا پر اس جنگ کو جنگ جمل کا نام دیا گیا۔ لڑائی کے دوران علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فوج نے ام المومنین عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گرد گھیرا ڈال دیا اور عملاً وہ مخالف فوج کی حراست میں آگئیں۔ ان کے آدمی موقع سے فرار ہو گئے۔ اس کے بعد جب صورتحال واضح ہوئی تو بہت دیر ہو گئی تھی۔ اس موقع پر عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے حریف معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف مدد کی پیشکش کی تاہم علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انتہائی احترام سے ان کی پیشکش کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان پر زور دیا کہ وہ واپس مدینہ تشریف لے چلیں اور ان کی شایان شان واپسی کے انتظامات بھی کر دیئے۔

مورخوں نے ایک اور بظاہر معمولی واقعہ کا ذکر کیا ہے جسے یہاں بیان کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ جنگ جمل سے قبل یا فوراً بعد کچھ مخلص مسلمانوں نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شکایت کی کہ قاتلین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کی فوج میں آزادی سے پھر رہے ہیں اور وہ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہے۔ اس پر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے آدمیوں سے پوچھا کہ قاتلین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کون ہیں؟ کم وبیش 12 ہزار آدمی اٹھ کھڑے ہوئے اور چلا چلا کر کہنے لگے ''میں ہوں۔ میں ہوں''۔ یہاں اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ اپنی نیک دلی کے باوجود علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وہ آزادی حاصل نہیں تھی جو ایک حکمران کو حاصل ہونی چاہیے۔

جنگ جمل میں کامیابی سے اگرچہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قد و قامت میں اضافہ ہوا مگر شام سمیت کئی بڑے صوبے ابھی تک ان کے کنٹرول سے آزاد تھے۔ اس اثناء میں معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ خط و کتابت جاری رہی۔ یہ تمام خط و کتابت اہل تشیع کی مشہور کتاب نہج البلاغہ میں محفوظ ہے جسے اہل سنت بھی وقیع گردانتے ہیں۔

انہی دنوں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ایک خط ''مشتہر'' ہو گیا جس میں انہوں نے لوگوں کو عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف بغاوت پر بھڑکایا تھا۔ شہادت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد جب یہ خط ان کے علم میں آیا تو انہوں نے کہا ''قسم اس ذات کی جس پر ایمان لانے والے یقین رکھتے ہیں اور فتنہ گر انکار کرتے ہیں میں نے اس جگہ بیٹھنے تک

کبھی ان لوگوں کو کچھ نہیں لکھا۔ (ابن سعد، III/i صفحہ 57) طبری کی روایت ہے کہ انہوں نے کہا ''اگر آپ کو (ناجائز) کوڑا بھی مارا جائے تو میں اس کی حمایت نہیں کر سکتی۔ کیا میں اس ناجائز تلوار کی حمایت کر سکتی ہوں جس سے عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کیا گیا۔ آپ لوگوں نے ان پر الزام لگائے لیکن جب آپ پر واضح ہو گیا کہ وہ پاک صاف چینی کی طرح پاکیزہ ہیں اور ان کا کردار دھلے ہوئے کپڑے کی طرح بے داغ ہے تو تم لوگوں نے انہیں قتل کر دیا۔ مسروق کی روایت ہے کہ انہوں نے کہا ''ام المومنین! یہ آپ ہی تھیں جنہوں نے لوگوں کو خط لکھ کر ان کے خلاف کھڑا کیا تو انہوں نے فرمایا ''میں قسم کھاتی ہوں اس ذات کی جس پر ایمان لانے والے یقین رکھتے ہیں اور فتنہ گر انکار کرتے ہیں۔ میں نے ان لوگوں کو کبھی کچھ نہیں لکھا۔ الاعمش مزید روایت کرتا ہے کہ ''اس طرح لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان کے نام سے جعلی خطوط لکھے گئے۔''

معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شروع میں کبھی خلافت کی خواہش ظاہر نہیں کی شاید وہ ''سابقین الاولین'' کی موجودگی میں اپنے آپ کو بہت چھوٹا محسوس کرتے ہوں لیکن بتدریج حالات نے دھکیل کر انہیں خلافت کے امیدواروں میں شامل کر دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ جس دن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان میرے کانوں میں پڑا ''اے معاویہ! اگر تمہیں حکومت ملے تو (لوگوں سے) مہربانی اور شفقت کا سلوک کرنا'' تو اس دن سے مجھے امید تھی کہ مجھے اقتدار نصیب ہوگا اور اس کا ذکر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ان کی خط و کتابت میں بھی موجود ہے۔

ابتدا میں انہوں نے صرف قتل عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سزا کا مطالبہ کیا اور پھر وہ یہاں تک آ گئے کہ سوال کرنے لگے کہ خلافت پر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حق کیسے ہے۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا موقف تھا کہ (1) میں نے آپ سے بہت پہلے اسلام قبول کیا اور اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خدمات انجام دیں جو آپ کی خدمات سے بہت زیادہ ہیں۔ (2) میرا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ہے اور خلافت اسی خاندان سے ہونی چاہیے جس کو اللہ تعالیٰ نے نبوت سے سرفراز فرمایا ہو۔ (3) مجھے انہی لوگوں نے منتخب کیا جنہوں نے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عثمان رضی

اللہ تعالیٰ عنہ کو منتخب کیا تھا یعنی اہل مدینہ نے اور صوبوں کو تو دارالخلافہ کے فیصلے کی تائید ہی کرنی چاہیے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کبھی اپنے دعوے میں وہ دلیل استعمال نہیں کی جس کی پابندی معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا کسی بھی دوسرے مسلمان پر فرض ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا (غدیر خم پر)۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سوچ کر کہ خلافت ایک دنیاوی اعزاز ہے پہلے تین خلفاء کے دور میں قربانی دے دی تھی مگر اس وقت جب وہ باقاعدہ خلافت کے دعویدار بن چکے تھے بلکہ بذریعہ شمشیر اپنے حق کے لئے لڑ رہے تھے اور اس وقت جب ان سے حق خلافت کے دعوے کے لئے دلائل کا مطالبہ ہو رہا تھا تو انہوں نے وہ فیصلہ کن دلیل کیوں پیش نہ کی (جو ان کے حق میں پانسہ پلٹ سکتی تھی)۔ جب علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں مصالحت کی کوششیں ناکام ہو گئیں اور نہ صرف شام بلکہ کئی دوسرے صوبے بھی معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بطور خلیفہ بیعت کے لئے تیار تھے تو جنگ ناگزیر ہو گئی۔ یعنی جنگ صفین۔ یہاں اس جنگ کی تفصیلات کی گنجائش نہیں۔ تاریخ کے ہر طالب علم کو اس کی تفصیلات ازبر ہیں۔ میں اپنی گذارشات کو صرف ان حوالوں تک محدود رکھوں گا جو اس آرٹیکل کے عنوان سے متعلق ہیں یعنی ان دونوں جنگوں کے پس پردہ یہودی ہاتھ۔ جب جنگ (صفین) کے دوران قرآن نیزوں پر بلند کر کے جنگ رکوالی گئی اور طے کیا گیا کہ خدائی فیصلہ کیا جائے گا یعنی قرآن سے ثالثی ہو گی تو یہ الاشعث بن قیس الکندی ایک یہودی النسل شخص تھا جس نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مجبور کر کے یہ فیصلہ کروایا اور پھر ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کا نمائندہ مقرر کروایا۔ (طبری 1، 5-3332) حالانکہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے باہمی تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ جنگ سے قبل علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے صاحبزادے حسن کو بصرہ بھیجا تھا کہ وہ وہاں سے جنگ کے لئے رضا کار بھرتی کریں اور ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بحیثیت گورنر یہ کہہ کر اس کام میں رکاوٹ ڈالی کہ خانہ جنگی ایک بڑا گناہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ غیر جانبدار رہیں (ایسی صورت میں)۔ اس حرکت سے برافروختہ ہو کر علی رضی اللہ تعالیٰ

عنہ نے انہیں گورنری سے معزول کر دیا اور اس کے فوراً بعد علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دوستوں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا نمائندہ نامزد کریں۔

برسہابرس کی تحقیق اور ذراسی بھی متعصّبانہ سوچ کے بغیر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شہادت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جانشینی کی جنگیں یہودی سازش کا نتیجہ تھیں۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تمام نیک نیتی سے لڑے اور ان کی قطعی کوئی ذاتی خواہشات نہ تھیں۔

X

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بستر وصال پر وصیت لکھوانے کا قصہ

پس منظر:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا ایک واقعہ راویانِ حدیث نے (تفصیلات میں) تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ ''اپنے بستر وصال پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا 'ایک کاغذ لاؤ میں آپ کو ایک تحریر لکھ (لکھوا) دوں جس کے بعد تم لوگ گمراہ نہ ہو گے، جس پر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سخت تکلیف میں ہیں اور ہمارے پاس قرآن جو ہے وہی ہمارے لیے کافی ہے'' جس پر وہاں موجود لوگوں میں اختلاف ہو گیا (کوئی کہنے لگا کاغذ لے آؤ، کسی نے کہا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بات مان لو) اس سے وہاں شور شرابہ سا ہو گیا جس پر (بجائے اس کے کہ رسول اللہ فرماتے کہ تم لوگ خاموش ہو جاؤ اور کاغذ لے آؤ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میرے پاس سے اٹھ جاؤ۔'' (بخاری 638/2،449،429/22/1)

اس معاملے کے حوالے سے تحقیقی تجسس اور اہمیت کے باوجود جہاں تک میرے علم میں ہے کہ کسی محقق نے اس موضوع پر الگ سے کام نہیں کیا کہ اس سے متعلق تفصیلی مواد کو یکجا کیا گیا ہو اور گہرائی تک جا کر اس بارے میں موجود ابہام دُور کرنے کی کوشش کی گئی ہو مثلاً یہ کہ آیا (کاغذ لانے کا حکم دے کر) آغاز کلام خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اور کے استفسار کے جواب میں یا کسی مطالبے پر ایسا کرنے کا حکم دیا۔ اور کیا واقعی عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ جرأت کی کہ وصیت لکھوانے

سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تعمیل سے روکا یا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے محض ان لوگوں کی سرزنش کی تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیماری کی حالت میں بھی چین نہیں لینے دے رہے تھے اور آپ کی خواہش صرف یہ ہو کہ ان کے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو غیر ضروری تکلیف نہ ہو۔

معاملہ کا تجزیہ کرنے سے قبل ضروری ہے کہ خود روایت میں پائے جانیوالے تضادات پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے یعنی کہ ایک طرف (روایت کے مطابق) بیماری کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی حالت اس قابل تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا اور پھر عین اسی لمحے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنے نحیف ہو چکے تھے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی چیز (کاغذ) لانے کا حکم دیا اور موقع پر موجود ایک شخص (عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے کہہ دیا 'نہیں ایسا نہ کرنا' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس قابل بھی نہ تھے کہ اختلاف کرنے والے کو خاموش کرا دیتے۔

مجھے اس واقعہ کے حوالے سے ایک اور پہلو پر اصرار ہے کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبول اسلام کے بعد کی پوری زندگی پر نظر ڈال لیجیے کیا کہیں ایک بھی ایسے واقعہ کا سراغ ملتا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مکمل خود سپردگی، اطاعت اور تعمیل کے سوا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کوئی اور رویہ روا رکھا ہو اور اگر جواب ''نہ'' میں ہے تو کیا یہ ممکن ہے بلکہ اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتمی انداز میں حکم دیں کہ 'یہ کرو' اور یہ سراپا سپاس اور مکمل اطاعت کا خوگر شخص عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ کہے کہ 'نہیں یہ نہ کرو' اور پھر اس بات پر اتنا اصرار کرے کہ باقاعدہ وہاں جھگڑا کھڑا ہو جائے اور شور و غوغا برپا ہو جائے۔ میں طویل تحقیق کے بعد جس نتیجے پر پہنچا ہوں اور جس کے لیے میں نے جگہ جگہ بکھری ہوئی تفصیلات جمع کر کے ایک تصویر مکمل کی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے جو ایک خاص مقصد سے وہاں تشریف لائے۔ لیکن ان کی بھی جرأت نہ تھی کہ حکمیہ لہجے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے کہ 'اپنے خاندان میں سے کسی کو اپنا جانشین نامزد کر کے تحریر لکھ دیں' بلکہ

انہوں نے نہایت ملائمت سے ملتجیانہ انداز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ''اپنی وصیت تحریر کر جائیں تا کہ ہم (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد) گمراہ نہ ہوں۔'' اس سے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مراد یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طویل خطبہ ارشاد فرمایا ہے اسے قلمبند کر لیا جائے (تا کہ اسے ضابطہ قانون کی حیثیت حاصل ہو جائے) اور یہ کہ اس دوران وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی تجویز دے دیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سیاسی جانشین بھی نامزد کر دیں مگر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے مقصد کو سمجھنے میں غلطی کی۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام اسلامی تعلیمات کا خلاصہ لکھوا دیں جس پر انہوں نے کہا کہ اسکی کیا ضرورت ہے جب کہ ہمارے پاس قرآن مجید موجود ہے۔ فطری طور پر حاضرین میں سے بعض کو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ مداخلت پسند نہ آئی اور انکی خواہش تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو مکمل حواس میں تھے اور ابھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں اتنی توانائی اور طاقت موجود تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حکم کی تعمیل کرواتے، وصیت لکھوانے پر اصرار نہ کرنا اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ کاغذ لانے کے مطالبے کی شروعات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرگز نہیں کی۔ ان تفصیلات کو بے نقاب کرتے ہوئے جن کی مدد سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا مجھے تسلیم ہے کہ یہ سب کچھ حرفِ آخر تو نہیں مگر حرف اوّل ضرور ہے جس سے مزید علم اور اس حوالے سے مزید جستجو کے نئے دروازے کھلیں گے اور اس طرح وقت کے ساتھ ساتھ ان گنت مزید چھپے پہلو سامنے آئیں گے۔

عمومی پس منظر:

609ء میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تخت نبوت پر جلوہ افروز ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے پیغام کو لے کر اپنی قوم کے پاس گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انتہائی ناخوشگوار صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ اس معاشرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مٹھی بھر جانثاروں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ چین سے جی سکتے تھے نہ ہی اپنے عقیدے کی تبلیغ کی

انہیں اجازت تھی۔ کسی ریاستی اختیار یا طاقت کا تو ذکر ہی کیا کہ اس حوالے سے کوئی طالع آزما آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد یا رقابت کا شکار ہوتا مگر ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو طاقت اور استحکام عطا کیا تو انہوں نے ایک چھوٹی سی ریاست کی بنیاد رکھی جسکی حدود میں اس تیزی سے اضافہ ہوا کہ ایک عالم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ ہجرت کے پہلے سال اسلامی ریاست کا وجود مدینہ شہر کے محض ایک چھوٹے سے ٹکڑے تک محدود تھا (پورے شہر میں بھی نہیں) جہاں مسلمان مدینہ کے دوسرے مکینوں، یہودیوں، عیسائیوں اور بت پرست عربوں کے مقابلے میں محض ایک اقلیت تھے مگر صرف دس سال بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو اسلامی سلطنت پورے عرب کی وسعتوں سے نکل کر شام اور عراق کے جنوبی علاقوں تک پھیل چکی تھی اور تیس لاکھ مربع کلومیٹر علاقے پر پرچم اسلام لہرا رہا تھا۔ جی ہاں تیس لاکھ مربع کلومیٹر جو کم وبیش پورے براعظم یورپ کے رقبہ کے برابر ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اوسطاً **845** مربع کلومیٹر علاقہ روزانہ گذشتہ دس سال سے اسلامی سلطنت کا حصہ بن رہا تھا اور اس سے بھی اثر انگیز یہ حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کا فرمان یہ تھا کہ "میں جنگ اور امن (رحمت) دونوں کا سفیر ہوں"۔ (ابن تیمیہ، **سیاست الشریعہ صفحہ 9**) انسانی جان کو اتنی اہمیت دی کہ اتنی وسیع سلطنت کے قیام کے لیے بہائے جانے والے خون کی مقدار **2** افراد فی ماہ سے زیادہ نہ تھی۔ دس سال یعنی **120** ماہ میں جتنی جنگیں ہوئیں ان میں دشمن کے محض **200** افراد ہلاک ہوئے جبکہ مسلمان شہدا کی تعداد اس سے بھی کم تھی۔

جزیرہ نمائے عرب ایک براعظم کی حیثیت رکھتا ہے جس میں یمن اس وقت عروج پذیر تہذیب کا گہوارہ تھا جب کہ (دوسری طرف) ابھی ایتھنز کی بنیاد بھی نہ رکھی گئی تھی۔ اس لیے نہ صرف عدنانی اور قحطانی قبائل بلکہ مضر اور ربیعہ (عدنانی قبائل کے اندر) حتیٰ کہ قریش اور سُلیم کے درمیان (مضر قبائل کے اندر) رقابتوں سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں۔ سن **4** ہجری میں جبکہ اسلامی ریاست ابھی مدینہ کی حدود سے باہر نکل رہی تھی (روایت البخاری **6/28/64**) کہ بئر معونہ کے المیہ کے "ہیرو" عامر بن طفیل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھمکی دی کہ یا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف دیہات (بادیہ) تک محدود ہو

جائیں اور پتھروں سے تعمیر کردہ گھروں اور چونے گارے کے گھروں کے مکینوں کو میرے حوالے کر دیں اور یا مجھے اپنا جانشین نامزد کر دیں ورنہ میں مدینہ پر ایک ہزار غطفانی شہ سواروں کے ساتھ حملہ آور ہونگا جس کے پیچھے ایک ہزار شہ سوار اور آ رہے ہوں گے۔ بہر حال وہ مدینے آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی جس میں اس نے بڑے تکبر کا مظاہرہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: میں تمہارے (صلی اللہ علیہ وسلم) تمام علاقے کو بے بال گھوڑوں سے روند دونگا اور ایسے شہ سواروں کو چڑھا لاؤں گا جنکی داڑھیاں نہیں ہونگی اور جتنے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ملک کے کھجوروں کے درخت ہیں اتنے گھوڑے لے کر آؤنگا (شرح دیوان لبید از احسان العباسی صفحہ 15)۔

صورت حال اتنی سنگین ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے دعا فرمائی:

''پروردگار! اس شخص سے میری حفاظت فرما۔''

یہ شخص عامر بن طفیل اتنا متکبر اور سرکش تھا کہ کچھ ہی عرصہ بعد جب وہ طاعون سے بیمار ہو گیا اور اسکے بچنے کی کوئی اُمید نہ رہی تو اس نے بستر پر جان دینے کی بجائے اپنے گھر والوں سے کہا کہ اسے اٹھا کر گھوڑے پر بٹھا دیں اور آخر کار اس نے گھوڑے پر ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ 6 ہجری کے لگ بھگ اس قسم کے اور واقعات بھی پیش آئے۔

(الف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیلمہ کذاب کو ایک خط روانہ کیا جس میں اُسے اسلام کی دعوت دی۔ اس نے جواب میں لکھا: ''اللہ کے رسول مسیلمہ کی طرف سے اللہ کے رسول محمدؐ کے نام۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام ہو، اما بعد بے شک مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حکومت میں شریک بنایا گیا ہے اور نصف زمین پر مجھے اور نصف پر قریش کو حق دیا گیا ہے لیکن قریش البتہ زیادتی کرنے والے لوگ ہیں (المقال فی الشرح الامثال صفحہ 62-61 اور آگے، میری کتاب الوثائق السیاسیہ نمبر A/205 ابن ہشام، طبری، حلبیؒ وغیرہ)۔

(ب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مکتوب ہوزہ بن علی ذوالتاج (یمامہ) کے نام ارسال فرمایا جس کے الفاظ یہ تھے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوذہ بن علی کے نام۔ ان لوگوں پر سلامتی ہو جو سیدھے راستے پر چلتے ہیں جان لو کہ میرا مذہب چاروں طرف جہاں تک اونٹ اور گھوڑے جا سکتے ہیں غلبہ حاصل کرنے والا ہے۔ اس لیے اسلام قبول کر لو اور تم حفاظت میں رہو گے جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ میں تمہارے پاس ہی رہنے دونگا۔
(مہر) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"

اس کا جواب ان الفاظ میں دیا گیا:
"کیسی اعلیٰ چیز ہے جس کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے بلا رہے ہیں اور یہ کتنی احسن ہے۔ میں اپنی قوم کا شاعر اور ان کا ترجمان ہوں اور عربوں پر میری ہیبت بیٹھی ہوئی ہے اس لیے کچھ کارپردازی (اختیارات) میرے ذمہ کر دیں۔ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرونگا۔" (میری کتاب الوثائق نمبر **A/99-68**، ابن سعد، حلبیؒ)

اختیارات اور طاقت کی خواہش انسانی فطرت ہے جبکہ اپنا بچاؤ کرنا انسانی جبلت کا خاصہ ہے۔ دوسری خصوصیت کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ ابوسفیان (جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے) اور اپنے تجارتی سفر پر شام گئے ہوئے تھے۔ انہیں ہرقل کے دربار میں طلب کیا گیا تا کہ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکیں۔ اس نے جو تاثر لیا (بقول بخاری **6/1/1**، **105/56**، **122/56**، **4/3/65**) وہ یہ تھا کہ "زرد آدمی کے پسماندگان کا بادشاہ (مللك بنى الاصفر) یعنی بازنطینی شہنشاہ، اس شخص (رسول اللہ) (صلی اللہ علیہ وسلم)) سے ہیبت زدہ ہو گیا۔"

اگر عرب کے غیر مسلم اقتدار اور طاقت کے متمنی تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اس کمزوری سے کیوں مبرا سمجھا جائے۔ اگر چہ انہوں نے اس خواہش کو بے لگام نہیں ہونے دیا لیکن تین مواقع ایسے تھے جب اس کا واضح اظہار سامنے آیا۔ پہلا موقع وہ تھا جب انصار نے (خصوصاً خزرج) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد) اقتدار کی خواہش کی اور ان کی دلیل یہ تھی کہ اہل مدینہ نے رسول اللہ کا دل و جان سے ساتھ دیا اور تبلیغ اسلام کی کوششوں اور جنگوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے

شانہ بشانہ رہے جبکہ اہل مکہ کی حیثیت مدینہ میں محض مہاجر کی تھی اس لیے خلافت انصار کا حق ہے۔ یہ باور کرنے کی وجوہ موجود ہیں کہ خزرج کی تعداد اوس سے زیادہ تھی اور ان کے لیڈر سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عبادہ سیاسی فہم و فراست سے بدرجہ اولیٰ بہرہ ور تھے (سقیفہ بنی ساعدہ میں ان کا اظہار)۔ دوسری مثال بنی ہاشم کی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خاندان تھے۔ ان کا موقف تھا کہ وراثت کے فطری قانون کا اطلاق خلافت پر بھی ہوگا چونکہ ریاست، بنوت کی زیر نگیں ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو ان کے گھر پیدا فرما کر انہیں اکرام بخشا ہے اس لیے سیاسی سیادت کا حق بھی تا قیامت ان کے خاندان کے پاس ہونا چاہیے۔ اس وقت حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا، خاندان کے سربراہ تھے اور ہم دیکھیں کہ اس موقع پر ان کا طرز عمل کیا تھا۔ اس سلسلے کا تیسرا حوالہ عام مسلمان تھے۔ مکہ کے اولین مسلمان قدرتی طور پر دوسروں سے ممتاز تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے دس کو جنت کی ان کی زندگی میں ہی بشارت دے دی تھی (عشرہ مبشرہ)۔ ان اصحاب کی خواہش تھی کہ اہل ترین افراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین بنیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ سن 4 ہجری میں بھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے درمیان موجود تھے حسد کی لعنت موجود تھی تو طاقت اور خوشحالی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اس میں بھی اضافہ ہوا خصوصاً فتح مکہ (8 ہجری میں) اور ایلہ، جربہ، اذرح وغیرہ (جنوبی فلسطین، 9 ہجری میں) کی فتح کے بعد جہاں مسلمانوں کی سیاسی قوت میں اضافہ ہوا وہاں مالی وسائل کی بھی بہتات ہوگئی۔ اس کے بعد پورے عرب سے قبول اسلام اور اطاعت قبول کرنے کی پیشکشوں کے ساتھ آنے والے وفود کا تانتا بندھ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک 63 سال ہو چکی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نرینہ اولاد زندہ نہ تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحت بھی روز بروز گر رہی تھی۔ اس کے باوجود جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پہلے اور آخری حج کیلئے جانے کا فیصلہ کیا تو چہار طرف پیغام روانہ کر دیئے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں سفر حج اختیار کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر جبل الرحمت سے جو بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا اس کو اپنے کانوں سے سننے کی سعادت کم و بیش ایک لاکھ 40 ہزار مسلمانوں کو حاصل

ہوئی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا خلاصہ یہ تھا:

اپنے سفرِ آخرت کی پیش گوئی، جان، مال اور آبرو کے حوالے سے انسانی حقوق کا تعین، لین دین اور کاروبار میں دیانت داری، قرضوں پر سود کا خاتمہ، فتنہ گری کی مکمل ممانعت اور اس کے خلاف جنگ کا اعلان، شمسی، قمری کیلنڈر ختم کر کے صرف قمری کیلنڈر رائج کرنے کا اعلان، میاں بیوی کے حقوق وفرائض کا تعین، طبقاتی امتیاز کا خاتمہ اور یہ کہ برتری صرف تقویٰ اور نیک اعمال پر ہوگی، عربوں کو عجمی مسلمانوں پر فضیلت حاصل نہیں ہوگی (مگر تقویٰ کی بنا پر)، قانونی حاکم کی اطاعت کا حکم چاہے وہ ناک کٹا نیگرو ہی کیوں نہ ہو، میرے بعد قرآن اور میری سنت کو مضبوطی سے تھامے رکھنا۔

(مکمل متن کے لیے ملاحظہ فرمائیں میری کتاب وثائق السیاسیۃ نمبر A/287، ابن ہشام)

عمومی اور سرسری نظر سے پڑھنے والوں کو شاید اس میں کوئی بڑی بات نہ ملے لیکن قرآن نے اس موقع پر ہی فیصلہ کر دیا ''آج میں نے تم پر اپنا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کیا'' (3/5) اس تاریخ ساز خطبے کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک سیاسی نظام کے تمام لوازمات سے بھرپور ہے اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خواہش نظر آتی ہے کہ عرب مسلمان اب سیاسی زندگی میں بھی مشرکانہ طور طریقے ترک کر کے اسلامی طرزِ عمل اپنائیں۔کیا عربوں کو یہ باور کرانا کہ عربوں کو عجمیوں پر کوئی فضیلت نہیں اور اپنے حاکم کی اطاعت کرو چاہے وہ سیاہ فام حبشی کیوں نہ ہو، ایک انقلابی نظریہ نہیں؟ اور یہ کہ فضیلت کا معیار صرف پرہیزگاری ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز حقیقت پسندانہ تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رائے عامہ کی بتدریج تیاری کو ترجیح دی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو اپنا جانشین نامزد کر سکتے تھے مگر اس طرح اسلامی سیاسی قانون میں لچک کی گنجائش نہ رہتی کیونکہ نہ صرف قرآن بلکہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مسلمانوں کے لیے ابدی قانون کی حیثیت حاصل ہے۔

حج الوداع سے واپسی پر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ینبوع کے قریب جھیل خم

(غدیر خم) کے مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور سیاسی مسئلے پر فیصلہ دیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (غالباً ٹیکس وصولی کے لیے) یمن بھیجا تھا جو وصول شدہ رقوم کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے مکہ چلے گئے تھے اور اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ جا رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ٹیم کے ارکان نے ٹیکسوں کی مد میں وصول ہونے والے کپڑے سے احرام بنا کر پہن لئے اور اس طرح سرکاری محاصل کے غلط استعمال کے مرتکب ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں یہ کپڑے واپس کرنے کا حکم دیا تو ان لوگوں نے بُرا منایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکائت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرکاری فنڈز کے بارے میں سختی سے دیانتداری کی ہدائت فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا ''جس کا میں دوست (یا سردار) ہوں اس کا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی دوست (یا سردار) ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **من کنت مولاہ، فا علی مولاہ**۔ پھر مزید فرمایا ''اے اللہ ان لوگوں کو اپنا مقرب بنا جو علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مقرب رکھتے ہیں اور ان لوگوں کو اپنا دشمن سمجھ جو علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دشمنی رکھتے ہیں۔'' اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر کسی زیردست یا ماتحت کو اختیار تفویض کیا جاتا ہے تو وہ اس سے بڑے یا پھر سب سے بڑے حاکم کی طرف سے ہوتا ہے اس پر تنازعہ نہیں ہونا چاہیے (اسکی اطاعت ہونی چاہیے جیسے کہ بڑے حاکم کی ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا مفہوم یہ تھا علی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی مقرر کردہ تھے اور ان کے حکم کی اطاعت ہونی چاہیے تھی)۔

لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ان ریمارکس کا مطلب انہیں اپنا جانشین مقرر کرنا نہ تھا اور خود حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کو اپنے دعویٰ ءخلافت کے حق میں دلیل کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ نہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتخاب کے موقع پر نہ ہی عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ بنائے جانے پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ دلیل دی۔ حتیٰ کہ جب امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ آپ رضی

اللہ تعالیٰ عنہ کا مسلح تصادم ہوا اس نازک موقع پر بھی آپ نے اس دلیل کا سہارا نہیں لیا حالانکہ اس موقع پر دونوں کے مابین ان گنت خطوط کا تبادلہ ہوا جس میں اپنے حق میں دونوں فریقوں نے دلائل کے انبار لگا دیئے۔ یہ تمام خطوط اہل تشیع کی بہت مشہور کتاب نہج البلاغہ میں محفوظ ہیں۔ ان خطوط میں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہر قسم کے دلائل دیئے (مثلاً یہ کہ میں آپ سے پہلے مسلمان ہوا، اسلام کی آپ سے زیادہ خدمت کی، میرا تعلق اس خاندان سے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا اعزاز بخشا وغیرہ) لیکن غدیر خم والے ارشاد کے حوالے سے کبھی ایک لفظ نہیں کہا۔ (سوال یہ ہے کہ) اگر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خم کے ارشادت کو اپنے آپ کو جانشین مقرر کیے جانے کا حوالہ سمجھتے تو یہ دلیل پیش کرنے کا اس سے بہتر موقع اور کون سا تھا جب دونوں میں دلائل کی جنگ جاری تھی اور خطوط کا تبادلہ ہو رہا تھا۔

حج الوداع سے واپسی کے چند روز بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ ایک روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات گئے مدینہ کے قبرستان جنت البقیع تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک خادم بھی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرحومین کے لیے دعائے مغفرت فرمائی اور بلاذری کی روائت کے مطابق (انساب 1544) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے مجھے ابدی حیات (تا قیامت) اور اپنے سے فوری ملاقات میں سے ایک چیز چن لینے کا اختیار دیا ہے اور میں نے اللہ سے فوری ملاقات کا انتخاب کیا ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں بھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم محسوس فرما رہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات فانی کے دن ختم ہونے والے ہیں اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبرستان تشریف لے جانا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داریوں کا حصہ تھا جس کا ذکر ابھی آگے آئیگا۔ سیاسی حوالے سے ساتھیوں کے لیے رہنما خطوط کا تعین اپنے رخصت ہو جانے والے ساتھیوں کے لیے دعائے مغفرت سے کم اہم نہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شبینہ مہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحت پر برا اثر ڈالا تاہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیماری کے باوجود اہم سیاسی ذمہ

داریوں کی بجا آوری میں بدستور مصروف رہے (مثلاً لشکر اسامہ کی روانگی، الاسود عنسی کے ارتداد کے فتنہ سے نمٹنے کے لیے ہدایات وغیرہ)

وصال سے تین روز قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہل خانہ سے فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سات کنوؤں کے پانی سے نہلایا جائے جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت قدرے سنبھل گئی اور اپنے عم زادوں کا سہارا لے کر مسجد تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر چڑھ کر ایک طویل خطبہ ارشاد فرمایا (بخاری 18/83/64، 22،76) جو نماز ظہر تک جاری رہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی امامت فرمائی۔ نماز کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار پھر منبر پر تشریف فرما ہوئے اور خطبہ کا سلسلہ جاری رکھا حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیماری اور کمزوری سے نڈھال ہو گئے۔ جس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے حجرہ میں لے جایا گیا جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر غشی طاری ہو گئی۔ بدقسمتی سے اس خطبہ کا متن کہیں محفوظ نہیں۔ سیرت نگاروں اور احادیث کے راویوں نے اس کا تذکرہ تو کیا ہے لیکن سرسری انداز میں۔ ذیل میں اس خطبے کی جو تفصیلات میں دے رہا ہوں اس کا ماخذ بخاری، ابن ہشام، طبری اور بلاذری کی تحقیق ہے۔ متن کے بالمقابل میں نے اپنی عاجزانہ رائے کا اظہار کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں تشریف آوری سے قبل ایک واقعہ پیش آیا جس کا تذکرہ ضروری ہے۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عیادت کے لیے گھر کے اندر تشریف لے گئے جب وہ باہر آئے تو لوگوں نے آپ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ اللہ کے فضل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت اب بہتر ہے جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک طرف لے گئے اور سرگوشی کے انداز میں کہا ”نہیں علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) آثار ایسے ہیں کہ تین روز بعد یہ مسئلہ تمہارے سامنے آنے والا ہے کہ اب معاملات کون چلائے گا اس لیے آؤ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ کون ہو گا کیونکہ اب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو نامزد نہیں فرمایا اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں

سے کسی کو نامزد فرماتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا اور اگر کوئی اور ہوا تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے گواہ ہوں گے۔'' حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انکار کر دیا اور کہا ''خدا کی قسم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھنے نہیں جاؤں گا کیونکہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آج ہمیں حکومت نہ دی تو کل کو کوئی ہمیں نہ لینے دے گا۔ (بخاری 8317/64 ابن ہشام، بلاذری، انساب ا، پیرا 1147)۔

اس کے فوراً بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے اور اپنا آخری خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس کے اقتباسات اور میری عاجزانہ رائے ملاحظہ ہو۔

1.	حمد و ثنا کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہدا احد کے لیے طویل دعا فرمائی۔	اس فرمان کو بقیع میں رات کو تشریف لے جانے کا تسلسل بنایا جائے تو یہ سرکاری پالیسی کا پہلا اصول بن جاتا ہے، کہ جن لوگوں نے ہمارے لیے خدمات انجام دیں انہیں فراموش نہ کیا جائے۔
2.	خدا کے ایک بندے کو خدا نے حیات ابدی اور اپنے سے فوری ملاقات میں انتخاب کا موقع دیا تو اس بندے نے فوری ملاقات (اللہ سے) کا انتخاب کیا۔	آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عنقریب وصال کی پیشگوئی فرمائی اور اس طرح صورتحال کی سنگینی واضح کر دی۔
3.	انصار کے طرز عمل اور اسلام کے لیے ان کی بے پایاں خدمات کی تحسین فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اے انصار تم دیکھو گے کہ میرے بعد تمہاری پسندیدہ چیزیں (یا لوگ) تمہارے خلاف جائیں گے۔ تم ان کی (مہاجرین) حمائت جاری	آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کہ (اندرونی اختلافات کے باعث مثلاً اوس اور خزرج کی مخاصمت، انصار اقتدار حاصل نہ کر پائیں گے اور اس میں خلیفہ کے لیے ہدائت کہ انصار سے کس طرح کا حسن سلوک روا

رکھنا یہاں تک کہ حوض کوثر پر ہماری ملاقات ہو جائے اور اے مہاجرین انصار سے حسن سلوک کا اپنے آپ کو پابند سمجھنا اگر وہ نیکی کریں تو ان کی تحسین کرنا اور اگر غلطی کریں تو ذرگذر کرنا۔	رکھیں (مثلاً سعد بن عبادہ جنہوں نے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں کی بیعت نہیں کی تھی)۔
4. ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کھلے دل سے تحسین، مسجد میں کھلنے والے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کے دروازے کے سوا دوسرے تمام دروازے بند کرنے کی ہدائت۔	ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عوام کے سامنے تحسین کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا کہ وہ تمام لوگوں سے افضل ہیں اور تا کہ وہ مسلمانوں کی صف اول میں آ جائیں اور امام کی حیثیت سے نمازیں پڑھائیں (اس طرح گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرما دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہی افضل انسان ہیں)۔
5. ”رومیوں کے خلاف مجوزہ مہم نظر انداز (یا ملتوی) نہ کی جائے اور اس کے نوجوان کمانڈر اسامہ کے بارے میں حقارت کے جذبات نہ ظاہر کئے جائیں جو اس منصب کے پوری طرح اہل ہیں جیسا کہ انکے والد زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی باصلاحیت تھے مگر ان کو بھی بعض لوگ ناپسند کرتے تھے۔“ (کیونکہ وہ آزاد کردہ غلام تھے)۔	محاذ کے حوالے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قسم کی نرمی کی اجازت نہیں دی حالانکہ فتنہ ارتداد سمیت کئی نئے محاذ کھل چکے تھے۔اس کے علاوہ تمام مسلمانوں میں مساوات اور طبقاتی امتیاز کے خاتمے پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قسم کی مصالحت کی اجازت نہیں دی۔

.6	''مجھ سے بے خوف ہو کر اپنے تمام حقوق طلب کرو اگر میں بھول جاؤں تا کہ میں اللہ کے پاس صاف دامن لیکر جاؤں'' (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بہت اصرار فرمایا اور خطبے کے دوسرے مرحلے میں ایک بار پھر اس کا ذکر کیا جس پر ایک شخص نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے پانچ درہم ادا کرنے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شکریہ کے ساتھ فوراً ادا کر دیئے۔	اگر سردار ہی بددیانت ہو جائے تو ماتحت لوٹ مار مچا دیتے ہیں۔ تمام سرکاری معاملات سے کرپشن کا خاتمہ کیا جانا چاہیے۔
.7	سرکاری خزانہ کے حوالے سے کسی قسم کی دھوکہ دہی نہیں ہونی چاہیے ورنہ قیامت کے روز باعث بدنامی ہو گا (جس پر ایک شخص نے اعتراف کیا کہ اس نے مالِ غنیمت کے تین درہم انچارج کو جمع نہیں کرائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کوتاہی کی وجہ دریافت فرمائی اور عذر قابل قبول ہونے پر اسے معاف کر دیا اور متعلقہ رقم وصول فرمائی۔	عوام کے اخلاق کی درستی میں مذہب کی اہمیت۔

جب نڈھال ہو جانے کے باعث خطبہ ادھورا رہ گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرے میں پہنچا دیا گیا تو خبر پھیل گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر غشی طاری ہو گئی ہے جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ تیزی

سے اس کمرے میں چلے گئے اور چچا ہونے کی حیثیت سے انہوں نے شاید اندر داخل ہونے کی اجازت بھی نہ لی۔ روائت کی جاتی ہے کہ جب حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اندر داخل ہوئے تو ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات موجود تھیں۔ انہوں نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اندر آتے دیکھ کر جلدی سے پردہ کر لیا اور سوائے حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سب نے چہروں پر نقاب لے لئے۔ (ابن حنبل ا، 1209، ابو یعلیٰ، (شاہ) ولی اللہ دہلوی نے **ازالۃ الخفا فی الخلافت الخلفاء** (ا صفحہ 103) میں بھی اس کا حوالہ دیا ہے)۔ (حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پردہ نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی محرم تھیں چونکہ ان کی حقیقی بہن ام فضل عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عقد میں تھی اور چونکہ دو بہنوں کا ایک ہی وقت میں ایک شخص سے نکاح ممنوع ہے اس لیے میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ''عبوری طور پر'' محرم تھیں۔ اس لیے انہیں عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پردہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی)۔

ابن ہشام کے مطابق عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالت اضطراب میں اندر آنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاج سے متعلق معلوم کرنا چاہتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ مبارک سختی سے بند تھا اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات نے حبشہ سے آئی ہوئی ایک دوائی دانتوں کے کناروں سے منہ میں ڈالی جس سے تھوڑی دیر بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت سنبھل گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کون سی دوا دی گئی ہے اور ان کے مرض کی تشخیص کیا ہے۔ جواب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم آزردہ ہوئے اور (شاید از راہ تفنن یا اظہار ناراضی کیلئے) فرمایا کہ یہ دوا ان سب کو پلائی جائے جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح دوا پلائی ہے سوائے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے، (اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت بھی اپنے حواس اور قوت ارادی پر مکمل قابو حاصل تھا۔ دریں اثناء اور لوگ بھی کمرے میں آ گئے جن میں عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شامل تھے۔

بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور دوسروں کی روائت ہے کہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا کہ کاغذ اور سیاہی لاؤ۔ میں آپ کو کچھ لکھوا دوں جس سے آپ لوگ میرے بعد گمراہ نہیں ہوگے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کسی کے توجہ دلانے کے نتیجے میں تھا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے از خود اسکی ضرورت محسوس فرمائی تھی، راوی اس بارے میں خاموش ہیں)۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس موقع پر مداخلت کی اور کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت تھکے ہوئے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید تکلیف میں کیوں ڈالتے ہو۔ ہمارے لیے قرآن ہی کافی ہے۔ اس موقع پر موجود بعض دوسرے لوگوں نے جن میں بقول مقریزی (امتاع، I، 546) ام المومنین حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنت جحش اور انکی ساتھی بھی شامل تھیں۔ اس پر اعتراض کیا اور کہا' کیوں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک چیز طلب فرما رہے ہیں تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دینی چاہیے۔ اس پر اور لوگ بھی بولنے لگے اور ایک شور برپا ہو گیا (جس سے ناخوش ہو کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "پیغمبر کی موجودگی میں جھگڑا نہیں ہونا چاہیے آپ لوگ یہاں سے اٹھ جائیں۔"

اس بیان کا تجزیہ کرنے سے قبل بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے چند اقتباسات صورتحال کو واضح کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

(الف) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: جمعرات، یہ کیسی جمعرات ہے اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے یہاں تک کہ زمین ان کے آنسوؤں سے نم ہو گئی۔ جمعرات کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت زیادہ ناساز ہو گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس لکھنے کا سامان لے آؤ میں آپ لوگوں کے لیے ایسی ہدائت لکھوا دیتا ہوں جس سے آپ مرے بعد گمراہ نہیں ہو گے لیکن لوگ اس بارے میں جھگڑنے لگے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں جھگڑا انتہائی نامناسب تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذہن اس وقت منتشر ہے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میرے پاس سے اٹھ جاؤ، مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو میں جس حالت میں ہوں وہ بہتر ہے اس سے کہ جس کی طرف تم مجھ کو بلا رہے ہو۔"

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین احکام کی وصیت فرمائی: (1) مشرکوں کو جزیرہ نما عرب سے نکال دو (2) سفیروں (بیرونی وفود) کو اسی طرح تحائف اور ہدایہ وغیرہ رخصتی کے وقت دیتے رہنا جس طرح میں دیا کرتا ہوں، تیسری بات پر راوی کا کہنا ہے کہ وہ بھول گیا (یعنی راوی) (بخاری 1/176/56).

(ب) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: جمعرات، یہ کیسی جمعرات ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت زیادہ ناساز ہوگئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میرے پاس (لکھنے کا سامان) لے آؤ میں آپ لوگوں کے لیے ہدائت (یا وصیت) لکھوا دیتا ہوں جس سے آپ میرے بعد گمراہ نہیں ہوگے۔

لوگ جھگڑنے لگے حالانکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں جھگڑا انتہائی نامناسب تھا۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے (حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اعتراض کے جواب میں) کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (بیماری کی شدت میں) معاذ اللہ کوئی ہذیان کی بات کر دی ہے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی دریافت کرلو۔ (اس بحث کا مفہوم یہ تھا کہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منع کیا تو جو لوگ لکھوا لینے کے حامی تھے کہنے لگے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں معصوم عن الخطا ہیں تو کیا حرج ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لکھوا لیا جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ خوف تو نہیں ہو سکتا کہ خدانخواستہ بیماری کی شدت یا بیہوشی میں کوئی خلاف واقعہ بات لکھوا دیں گے۔ ان کے الفاظ تھے ''اَھَجَرَ استفہِمُوہ'' (کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماری کی دشت یا غلبہ میں معاذ اللہ کوئی ہذیان کی بات کی ہے یعنی اَھَجَرَ کے الفاظ بطور استفہام انکاری الزاماً کہے گئے وہ خود اس کے قائل نہ تھے)۔

جب تکرار جاری رہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اس لیے کہ میں اس حال میں اس سے بہتر ہوں جس طرف مجھے تم بلا رہے ہو''۔

اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کے طور پر 3 باتیں کہیں "یعنی مشرکوں کو جزیرہ نما عرب سے نکال دینا اور بیرونی سفیروں کو اسی طرح تحائف دیتے رہنا جس طرح میں دیا کرتا ہوں۔"

تیسری بات پر راوی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے یا راوی نے کہا میں تیسری بات بھول گیا ہوں۔ (بخاری 3/83/64)

(ج) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سخت تکلیف میں تھے وہاں گھر میں بہت سے افراد کی موجودگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے پاس لاؤ (جس پر لکھتے ہیں) میں آپ کے لیے ہدائت لکھوا دیتا ہوں جس کے بعد آپ گمراہ نہیں ہو گے۔"

حاضرین میں سے بعض نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سخت تکلیف میں ہیں اور آپ لوگوں کے پاس قرآن مجید موجود ہے اور یہ قرآن ہمارے لیے کافی ہے۔

اہل بیت (رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان والے) اور جو لوگ وہاں موجود تھے ان میں اس مسئلے پر اختلاف ہو گیا اور وہ جھگڑنے لگے۔ بعض کہہ رہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لکھوالو وہ آپ کو ایسی بات لکھوا دیں گے جس سے آپ گمراہ نہیں ہو گے جبکہ کچھ لوگ اسکی مخالفت کر رہے تھے جب شور اور تکرار بڑھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہاں سے اُٹھ جاؤ۔"

یہ بات قابل ذکر ہے کہ راوی ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر اس وقت صرف 10 سال تھی اور وہ اس وقت موجود بھی نہ تھے۔ یقیناً انہوں نے یہ ساری تفصیلات اپنے والد محترم اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بہت بعد میں معلوم کی ہونگی اور اس طرح ان سے تفصیلات خلط ملط ہو گئیں۔

جمعرات کا روز وہ دن ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا جبکہ مشرکین کو نکال دینے کی بابت وصیت فرمانے سمیت باقی تمام معاملات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے عین آخری لمحات میں انجام پائے غالباً پیر کے روز۔

آنسو بہانا خاص طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ انہیں شدت سے بعض چیزوں کا یقین تھا

مثلاً کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جانشین کے طور پر عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا پھر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتخاب کریں گے۔ مزید یہ کہ روایت (الف) اور (ب) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کی شدت سے ذہنی انتشار سے متعلق الفاظ کا مفہوم یکساں نہیں ہے۔ اگر کاغذ لانے کا حکم (یا ایک روایت کے مطابق کندھے کی ہڈی جوان دنوں لکھنے کے لیے لوح کے طور پر استعمال ہوتی تھی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا ہوتا تو یہ ناقابلِ تصور تھا کہ کوئی شخص اس میں مداخلت کرتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتا (اگر کوئی ایسا کرتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوراً فرماتے ''خاموش! کاغذ لاؤ''۔)

یہ فطری بات ہے کہ ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس رول کا تذکرہ نہیں کر سکتے تھے جوان کے والد محترم نے اس موقع پر ادا کیا۔

ہمارا تاثر یہ ہے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان میں خلافت لانے پر تلے ہوئے تھے اور جب حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ترغیب پر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے سے انکار کر دیا تو وہ اکیلے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے گئے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بیماری کا غلبہ کم ہوا تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وصیت لکھوا دیں۔ غالباً وہ چاہتے تھے کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں ارشاد فرمایا تھا اس تمام کو قلمبند کروا دیں ان کا خیال تھا کہ اس دوران وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خلافت کے بارے میں کوئی واضح ہدایت جاری کرنے پر آمادہ کرلیں گے اور یہ بھی کہ خلافت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان میں رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحت کی حالت کے پیش نظر یہ بوجھ ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ اس لیے امکان غالب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازخود ہی یہ حکم جاری نہیں فرمایا تھا کہ ان کے پاس لکھنے کا سامان لایا جائے بلکہ یہ اپنے چچا حضرت عباس رضی

اللہ تعالیٰ عنہ کے زور دینے پر کیا تھا جن کا آپ کے دل میں بڑا احترام اور مقام تھا۔ اگر یہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آیا ہوتا تو کوئی بھی شخص اس کی تکمیل اور تعمیل میں رکاوٹ نہ بنتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکمل حواس میں تھے اور آپ کی قوت ارادی پوری طرح بیدار تھی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند منٹ پہلے ان لوگوں کے لیے ''سزا'' تجویز کی تھی جنہوں نے دوا دیتے وقت احتیاط کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی کو پیش کرنے سے پہلوتہی نہیں کر سکتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ کہ ''میں اس حال میں اس سے بہتر ہوں جس کی طرف تم مجھے بلانا چاہ رہے ہو'' کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلافت کا مسئلہ حل طلب حالت میں چھوڑنا اس پر کوئی حتمی فیصلہ دینے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہتر خیال فرماتے تھے۔ ورنہ مسلم اُمہ قیامت تک (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طے کردہ) آئینی نظام کو بدل نہ سکتی۔

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے چند مزید گذارشات:

''جمعرات'' سے تین دن بعد پیر کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر کچھ علامتیں دیکھ کر پیش گوئی کی تھی۔ جونہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ تیزی سے اپنے بھتیجے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پہنچے اور کہا ''اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو میں تمہارے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرتا ہوں دوسرے لوگ ہماری تقلید کریں گے۔'' مگر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ ایسے کاموں کے لیے مسلمانوں سے مشورہ ضروری ہے اور مزید یہ کہا کہ ہمارے حقوق اور حق کو کون نظر انداز کر سکتا ہے۔

(بلاذری، انساب ا، پیرا 1180، 1185)

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے اور طنزیہ انداز میں

کہا:

''میں نے تمہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا''۔ (بلاذری پیرا 1180)

بخاریؒ، مسلمؒ اور کئی دوسرے راوی اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں''.......... اپنی آخری بیماری کے ایام میں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: 'اپنے باپ اور بھائی کو میرے پاس بھجواؤ تا کہ میں (ان کے حق میں) ایک وصیت لکھوادوں کیونکہ مجھے خدشہ ہے کہ کوئی خواہش کا اظہار کردے گا یا کہے گا میں اس سے بہتر ہوں۔ پھر تھوڑا سا توقف کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں رہنے دو نہ ہی اللہ تعالیٰ اور نہ ہی مسلمان ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوا کسی اور کو قبول کریں گے۔ (بخاری 2/16/75 اور 1/51/93، مسلم باب فضائل الصحابہؓ، II، ابن حنبل، مسند 6/106, 6/144 بلاذری، انساب I، پیرا 1096)

اس موضوع کے اختتام پر ایک بہت اہم اور احسن روایت ...... مسلمانوں کی طرف سے اپنی بیعت کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسلسل 3 روز تک مدینہ کی گلیوں میں یہ منادی کروائی کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کو بیعت کی پابندی سے آزاد کرتے ہیں اور آپ کو یہ موقع دیتے ہیں کہ آپ ان کی بجائے ان سے بہتر کسی شخص کو منتخب کرلیں۔ (بلاذری، انساب I، پیرا 1189)

منصب خلافت کا حقیقی حقدار کسے ہونا چاہیے تھا ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسا بے لوث شخص یا وہ لوگ جو اس کے متمنی تھے!

XI

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہلے خلیفہ کیوں نہ ہوئے؟

حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ (پہلے) خلیفہ کے عہدہ پر منتخب نہ کیے گئے۔

کیوں؟

مسلمانوں کے مابین ایک ہزار سال سے زائد عرصہ سے یہ اختلافی معاملہ رہا ہے اور (مختلف) عقائد کا ایک سوال بن چکا ہے اس نے اختلاف رائے اور تفریق پیدا کی ہے اور شیعہ، سنی کو تقسیم کیا ہے۔ میں اس بات کا بناوٹی دعویٰ نہیں کرتا کہ میں (مختلف فرقوں کے مابین) مصالحت کرا سکتا ہوں۔ میں حتیٰ کہ یہاں اس بحث کا آغاز بھی نہیں کرنا چاہتا کیونکہ اس کا تعلق نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات سے نہیں تاہم چند تاریخی حقائق کو واضح کیا جا سکتا ہے۔

الجاحظ (مشہور عربی ادیب) نہ تو سنی تھا اور نہ ہی شیعہ بلکہ معتزلی (مسلمانوں کا ایک فرقہ جو اس بات کا قائل ہے کہ رب تعالیٰ کو دنیا و آخرت میں دیکھنا ممکن نہیں) تھا۔ وہ حتیٰ کہ عالم دین بھی نہیں تھا بلکہ ایک ادیب و لکھاری تھا۔ اس کی آراء مسلمانوں کے لیے کوئی قانون کی حیثیت نہیں رکھتیں تاہم اُس نے اپنی کتاب ''رسالہ عثمانیہ'' (جس کا ایک لاثانی قلمی نسخہ استنبول کی ایک لائبریری میں موجود ہے اور اب چھپ چکا ہے) میں ایک نکتہ اُٹھایا ہے جس نے مجھے غور و فکر کے لیے مواد فراہم کیا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ شیر خدا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک بہت بڑے جنگجو اور میدان جنگ کے شہسوار تھے۔ انہوں نے سپہ سالار اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم

کی سربراہی میں لڑی جانے والی جنگوں میں مکہ مکرمہ کے انتہائی مشہور و معتبر افراد کو قتل کیا تھا۔ ان افراد کی اولادیں مشرف بہ اسلام ہو چکی تھیں لیکن انسان ہونے کے حوالے سے (یعنی جذبات واحساسات رکھنے کی وجہ سے) وہ یہ نہیں بھولے تھے کہ یہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی تھے جنہوں نے ان کے والدین کو قتل کیا تھا۔ چنانچہ الجاحظ کے خیال میں وہ لوگ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ بنانے میں زیادہ پُرجوش وسرگرم نہیں تھے۔ یہ رائے عمدہ ہے مگر میرے خیال میں یہ اتنی زیادہ متعلقہ نہیں کیونکہ یہ مسلم نوجوان نہیں تھے جنہوں نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد خلافت کے معاملہ کا فیصلہ کیا تھا بلکہ یہ بڑے تجربہ کار بزرگوں کا فیصلہ تھا۔

دراصل یہاں وراثت کے مسئلہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حکومت کوئی ایسی جائیداد نہیں کہ جو وارثوں کو منتقل کی جائے۔ اگر ایسا ہوتا بھی تو اس کے باوجود آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما چکے تھے کہ "ہم پیغمبروں کی کوئی ایسی ذاتی جائیداد (ترکہ) نہیں ہوتی کہ جسے وراثت کے طور پر تقسیم کیا جائے۔ جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ حکومت کی ملکیت ہوتا ہے (صدقہ)'' اگر کوئی شخص اس (فرمان) کو ان معنوں میں نہ لے اور یہ کہے کہ اس کا سیاق وسباق مختلف تھا تو پھر بھی یہ واضح ہے کہ اسلامی قانون وراثت کے مطابق قریب ترین رشتہ دار کو حق وراثت میں دُور کے رشتہ دار پر فوقیت حاصل ہے اور اس بات پر ہر شخص متفق ہے کہ چچا کے بیٹے کی نسبت بذات خود چچا زیادہ قریبی رشتہ دار ہوتا ہے۔ سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا العباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اُس وقت زندہ تھے۔ مزید یہ کہ صرف حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی چچازاد نہیں تھے بلکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے چچازاد بھی وہاں موجود تھے اور حکومت کسی صورت بھی کئی وارثوں میں تقسیم نہیں کی جا سکتی تھی۔ وراثت بیٹیوں کو بھی ملتی ہے اور بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا وہاں موجود تھیں۔ یہ ثابت نہیں ہے کہ عورت کسی مملکت یا سلطنت کی حکمران نہیں بن سکتی کیونکہ قرآن الحکیم ملک سبا کی ملکہ بلقیس کے بارے میں بیان کرتا ہے اور تصدیق کرتا ہے کہ اُس نے پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ چنانچہ بہتر یہی ہے کہ وراثت کی بنیاد پر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ

عنہ کے حق (خلافت) پر گفتگو نہ ہی کی جائے۔

نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کی تصدیق کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کسی بھی مسلمان کی بدگمانی دُور کر دے گی۔ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واقعی انہی معنی و مفہوم میں وصیت کی تھی؟ مجھے درج ذیل حقیقت کی بناء پر یقین کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بذات خود اس (وصیت) کا حوالہ کیوں نہ دیا؟ اس امر کو تو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظروں میں خلافت کا حصول غیر اہم بات تھی چنانچہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا (بطور خلیفہ) انتخاب ہوا تو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ذاتی قربانی دی اور کوئی اعتراض نہ کیا مگر بعد ازاں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ خط و کتابت میں وہ کیوں خاموش رہے؟ انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دعویٰ کو تسلیم نہیں کیا یہاں تک کہ انہوں نے اس کے خلاف ہتھیار اُٹھانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ شیعوں کی کتابوں میں مثال کے طور پر "نہج البلاغہ" میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مابین خلافت کے معاملے پر دعویٰ اور جواب دعویٰ کی خط و کتابت کا ریکارڈ موجود ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دلیل دیتے ہیں کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان میں سے ہیں۔ ظاہراً یہ وراثت کا حوالہ ہے مگر اس خط و کتابت میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے اس بات کا اقرار و دعویٰ ہو کہ سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے حق میں کوئی وصیت کی تھی۔

میری منکسرانہ اور عاجزانہ رائے میں خلافت کے سوال کے حوالے سے مسلمانوں کو مزید تفریق و تقسیم کا شکار نہیں ہونا چاہیے کیونکہ نہ تو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نہ ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور نہ ہی حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اب بقید حیات ہیں۔ ان سب کا معاملہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے سپرد ہے۔ یہ عملی سیاست کا معاملہ

نہیں ہے کہ اس پر بحث کی جائے اور پھر اس پر اختلاف کیا جائے کہ آیا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سیاسی قوت و طاقت کے حوالے سے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پہلا اور فوری جانشین ہونے کا حق تھا یا نہیں!

ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے نبی مکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزیز ترین خواہشات کو حیرت انگیز طور پر پورا کیا۔

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برسرعام اعلان فرمایا کرتے تھے "ہم ان لوگوں کو حکومتی عہدے نہیں دیتے جو اشتیاق کے ساتھ اس کے متلاشی ہوتے ہیں"۔ یہ ضروری تھا کہ جو افراد سرورکونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت قریبی ہوں اور گہرے دوست ہوں ان پر اس قسم کی خواہش کا الزام نہ آئے۔ ہم جانتے ہیں کہ کس نے خلافت کی خواہش کی اور کس نے نہیں! حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر خلافت کی کم ترین درجے کی خواہش کا الزام لگایا جا سکتا ہے (یعنی انہیں اس کی خواہش بالکل نہیں تھی)۔

پیغمبر انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام قوموں اور نسلوں کی مکمل مساوات کا اعلان بھی کیا تھا اور صرف ایک برتری جس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تسلیم کیا وہ خوفِ خدا کی بنیاد پر انفرادی تقویٰ اور پرہیزگاری تھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریبی رشتہ دار کا (بطور خلیفہ) انتخاب (چاہے وہ رشتہ دار کتنا ہی پرہیزگار اور عہدہ کے کس قدر اہل کیوں نہ ہو) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اصول سے سمجھوتہ سمجھا جاتا اور اس سے ایک نئی روایت قائم ہوتی اور شاہی سلسلہ (ایک ہی خاندان کے افراد کی یکے بعد دیگرے حکومت) پیدا ہوتا۔ آیئے ہم یاد کریں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تعلق قبیلہ بنو تیم سے تھا جو کہ قریش کی ایک شاخ تھی اور قبل از اسلام سب سے زیادہ حقیر سمجھی جاتی تھی کیونکہ یہ لوگ مشہور سردار قصیؔ کی بھی اولاد یا نسل سے نہیں تھے۔ ایک شاعر نے طنزاً اور مذاقاً کہا تھا:

"عوامی اور حکومتی معاملات کا اُس وقت فیصلہ کیا جاتا ہے جب قبیلہ

تیم کے افراد حاضر نہیں ہوتے اور حتیٰ کہ جب وہ حاضر ہوتے ہیں تو کوئی بھی اُن سے مشورہ نہیں کرتا۔"

اسلام میں شجرۂ نسب کے حوالے و اہمیت کے بغیر کسی شخص کی ذاتی و انفرادی صلاحیتوں کی عظمت کے اعتراف نے بعد ازاں آزاد شدہ غلاموں کو بھی کسی ہچکچاہٹ کے بغیر بطور حکمران قبول کرنے کا راستہ کھول دیا۔

پچیس (25) مواقع پر جبکہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی مہم پر مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تو ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (مدینہ منورہ میں) اپنا نائب نامزد کیا جسے مؤرخین نے "خلیفہ" کہا ہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر دفعہ ایک ہی فرد کو نامزد نہیں کیا تا کہ یہ تاثر نہ لیا جائے کہ یہ حکومت کی دوسری بڑی شخصیت ہے، ظاہری یا حقیقی وارث ہے یا ولی عہد ہے۔ ان افراد میں نہ صرف مکی تھے بلکہ مدنی بھی تھے۔ قبیلہ کنانہ سے تعلق رکھنے والے بھی تھے اور کئی مرتبہ حتیٰ کہ بصارت سے محروم فرد بھی جیسا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر مدینہ منورہ سے اپنی آخری غیر موجودگی کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسی تازہ ترین مثال قائم کی۔

ہم آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اکثر حوالہ دیئے جانے والے فرمان کے سیاق وسباق سے لاعلم ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ "امام (سربراہانِ مملکت) قریش سے ہیں"۔ میں بذات خود اس بات پر یقین کرنے کی وجوہات رکھتا ہوں کہ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک پیش گوئی تھی لیکن حکم نہیں تھا۔ درحقیقت اس فرمان کو میں نے حدیث میں پایا ہے جہاں سرور کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ پیش گوئی کی ہے کہ کئی خلفاء ہوں گے اور سب قریشی منبع اور اصل رکھنے والے ہوں گے۔ مزید یہ کہ خلیفہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بعد ازاں پریشان ہوئے کہ کس کو اپنا جانشین نامزد کریں اور کہا کرتے تھے کہ "اگر حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام حضرت سالم زندہ ہوتے تو میں کسی ہچکچاہٹ کے بغیر انہیں اپنا جانشین منتخب کر لیتا۔ اور یہ حضرت سالم قریشی نہیں تھے حتیٰ کہ عربی بھی نہیں تھے کیونکہ سوانح نگار ابن عبدالبر کی کتاب "الاستیعاب" کے مطابق وہ ایرانی النسل تھے اور ان کا تعلق فارس کے قلعہ اور دارالسلطنت اصطخر سے تھا۔

جب میں پرائمری سکول میں پڑھتا تھا تو وہاں میرے ایک اُستاد نے ہمیں کلاس میں ایک ایسی بات بتائی تھی جو اُس وقت سے میرے لیے غور وفکر کا باعث بنی رہی ہے۔ انہوں نے کہا تھا:

> ''آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحیح تربیت یافتہ چاروں خلفاء راشدین میں سے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب سے کم عمر تھے۔ اگر وہ شروع ہی میں پہلے خلیفہ منتخب کر لیے جاتے تو ہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذاتی خوبیوں اور صلاحیتوں کے استفادہ سے محروم رہ جاتے کیونکہ وہ اپنی اپنی خلافت شروع ہونے سے پہلے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں ہی وفات پا چکے ہوتے اور یہ رب تعالیٰ جل شانہٗ ہی کی طرف سے ہوا ہے کہ ہم نے ان سب کی قابلیتوں اور صلاحیتوں سے فائدہ حاصل کیا ہے۔''

آخر میں ایک اور وجہ جس سے ہر مسلمان چاہے وہ سنی ہو یا شیعہ اتفاق کرے گا کہ یہ دنیا وقتی اور فانی ہے اور ہمیشہ رہنے والی دنیا یعنی آخرت (عالم بقا) دونوں دنیاؤں میں سے زیادہ اہم ہے۔ دنیاوی و زمانی اور سیاسی معاملات کا تعلق اس جہان سے ہے جبکہ روحانی معاملات کا تعلق آخرت سے ہے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انسانی معاملات اپنے ہاتھوں میں رکھے، چاہے وہ دنیاوی و زمانی تھے یا دینی و روحانی تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عالم بقا کی جانب تشریف لے جانے کے بعد مسلمان قومیت نے انہیں دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ **(1)** بیرونی حصہ **(2)** اندرونی حصہ

بیرونی حصہ میں نہ صرف سیاست بلکہ بیرونی دینی عبادات و اعمال نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کو بھی شامل کیا گیا۔ اندرونی حصہ میں تمام روحانی معاملات کو جمع کر دیا گیا جنہیں ہم عام طور پر تصوف کے نام کے تحت لاتے ہیں۔

نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان دونوں حصوں کے

لیے الگ الگ جانشین ہیں اور دونوں کو خلیفہ کہا جاتا ہے۔ اس تخصیص کے ساتھ بیرونی
حصہ کے لیے ایک ہی وقت میں ایک سے زائد خلیفہ کو کوئی بھی برداشت نہیں کرسکتا (اور ہم
دیکھ چکے ہیں کہ انصار مدینہ کی یہ تجویز کہ دو امیر (خلیفہ) بنا دیئے جائیں آغاز ہی میں فوراً
رد کر دی گئی) جبکہ جہاں تک اندرونی (روحانی) حصہ کا تعلق ہے سرور کونین حضرت محمد
مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریبی خلفاء کی تعداد کی کوئی حد نہیں کیونکہ اس (روحانی)
سلطنت میں حسد نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔

درحقیقت روحانی سلطنت وحکومت میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے
ساتھیوں میں سے بے شمار افراد خلیفہ رہے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ نقشبندیہ (سلسلہ) کے
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ روحانی خلیفہ تھے جبکہ قادریہ یا سہروردی (سلسلہ)
کے روحانی خلیفہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ حتیٰ کہ ایک ہی علاقہ وشہر میں
بیک وقت دونوں بھی خلیفہ تھے۔ اس بات کی اجازت دی گئی کہ ایک مسلمان دونوں سے
(اور کئی سے) بیک وقت اطاعت وتعلق قائم کرسکتا ہے۔ یہ آجکل عام بات ہے کہ ایک
شخص نقشبندیہ اور سہروردیہ دونوں سلسلوں سے بیک وقت منسلک ہوتا ہے۔ سنی اور شیعہ
دونوں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ باقی سب کچھ میرے نزدیک لفظوں کو مختلف معانی و
مفاہیم دینے کے لیے دلیلیں ہیں۔ رب رحمٰن ورحیم ہماری رہنمائی اور حفاظت فرمائیں!